مرج البحرین
اردو

تصنیف لطیف

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و ترجمہ:

علامہ اقبال احمد فاروقی ایم اے

مکتبہ نبویہ ○ لاہور

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ

مَرَجَ الْبَحرَین

تصنیف لطیفہ

حضرت شیخ عبد الحق محدث و محقق دہلوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حالات و تصانیف

جناب خلیق احمد صاحب نظامی ایم اے

استاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ترتیب و ترجمہ

پیرزادہ علامہ اقبال احمد فاروقی ایم اے

مکتبۂ نبویہ میلارام روڈ، لاہور

مضامین وموضوعات

صفحہ

صفحہ

حالات و تصانیف

شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

از

جناب خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے

اُستاذ شعبۂ تاریخ

مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(مطبوعہ: پنجاب پریس لاہور)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کو اسلامی ہند کی علمی اور مذہبی تاریخ میں ایک خاص اہمیت اور عظمت حاصل ہے۔ تقریباً نصف صدی تک دہلی میں ان کی خانقاہ علم و فضل کا گہوارہ اور ارشاد و تلقین کا مرکز رہی ہے۔ ہزاروں تشنگانِ علم نے وہاں آکر اپنی پیاس بجھائی ہے۔ سینکڑوں گم گشتگانِ علم نے وہاں آکر روشنی حاصل کی ہے

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ است

یہ زمانہ وہ تھا۔ جب دنیا پرستی کی لعنت نے عزم و راستی کی روح کو مردہ کر دیا تھا۔ مذہبی گمراہی کے سوت محلوں سے پھوٹ کر جھونپڑوں میں بہہ رہے تھے۔ مذہب "کرمک شب تاب" کی صورت ہو چکا تھا۔ شریعت و سنت سے بے اعتنائی بڑھ رہی تھی۔ علماء کے دامن ہوا و حرص میں آلودہ تھے۔ صوفیہ دنیا پرستی میں غرق تھے۔ سرمایۂ ملت منتشر ہو رہا تھا۔ قرآن و حدیث سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ الحاد و زندقہ، حکمت و اجتہاد کے دلفریب عنوان سے پھیلایا جا رہا تھا۔

مشیت کا مگر دریائے رحمت جوش میں آیا

کہ حجاز کے ایک خضر طریقت اور منبع علم و فضل بزرگ حضرت شیخ عبد الوہاب

---

(۱) مکتوب امام ربانی مجدد الف ثانیؒ

متقی نے اپنے حلقۂ تلامذہ سے ایک ہونہار ہندوستانی طالب علم کو یہ کہہ کر کھڑا کر دیا۔

"بہ دہلی واپس باید رفت زیرا کہ دہلی بہ فراقِ شما نالاں است" — دہلی واپس چلے جانا چاہیئے کیونکہ دہلی تمہاری جدائی میں نالاں ہے

اس شخص کا ہندوستان آنا گویا ایک علمی انقلاب کا رونما ہونا تھا علوم دینی نے جن پر عرصہ سے مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی مسیحائی سے جلا پا گئے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں دعوت و اصلاح کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ خود اس نے اپنی زندگی کا واحد مقصد احیائے علوم دین و ترویج شریعت کو قرار دیا اور پکار کر اعلان کیا۔

"ایں بندہ ماموراست کہ خبر در ابواب دین و ملت کہ باعث ترویج و تجدید شریعت و موجب حفظ عقائد و احکام سنت باشد تکلم نکند و از دائرہ اعتدال و حیطۂ احتیاط بیروں نیفتد[1]"

چورانوے سال کی عمر میں جب داعیٔ اجل کو لبیک کہنے کا وقت آیا تو اس کی تصنیفات کے ہزاروں صفحات اس اعلان کی پابندی میں دیکھے ذوق و انہماک کی شہادت دے رہے تھے۔ ہزاروں انسان جن کے قلوب شریعت و سنت کے احترام سے معمور تھے۔ اس کے احسان کی گرانباری کو محسوس کر رہے تھے۔ درس و تدریس کا ایک نیا سلسلہ شمالی ہندوستان میں پھیل چکا تھا۔ فضاؤں میں یہ آواز سنائی دے رہی تھی ؎

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

---

(۱) کتاب المکاتیب والرسائل ص ۲

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے اجداد میں جس بزرگ نے سب سے پہلے سرزمین پاک و ہند میں قدم رکھا وہ آغا محمد ترک تھے۔ آغا محمد ترک بخارا کے رہنے والے تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں جب مغلوں نے وسط ایشیا میں آگ اور خون کا ہنگامہ برپا کیا۔ تو وہ اپنے وطن کے حالات سے بددل ہو کر ترکوں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ ہندوستان تشریف لے آئے۔ یہ سلطان علاؤ الدین خلجی ۶۹۶ھ۔ ۷۱۶ھ کا دورِ حکومت تھا مسلمانانِ ہند کا سیاسی اور ثقافتی عروج انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ سلطان نے آغا محمد ترک کی دستگیری کی۔ اور ان کو اعلیٰ مراتب اور عہدوں سے نوازا۔ ان دنوں گجرات کی مہم کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ سلطان نے انہیں گجرات کی مہم پر روانہ کر دیا۔ آغا محمد نے گجرات کی فتح کے بعد وہیں سکونت اختیار کر لی۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے کثیر اولاد دی۔ مگر ایک عرصہ کے بعد ایک جانکاہ سانحہ پیش آیا جس سے آپکی ساری اولاد لقمہ اجل بن گئی۔ اور صرف آپ کا بڑا لڑکا ملک معز الدین باقی بچا۔ اس سانحہ سے آغا محمد کی قلبی کیفیت اتنی دگرگوں ہو گئی کہ جو شخص دہلی سے ایک فاتح کی حیثیت سے فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا گجرات میں داخل ہوا تھا۔ ماتمی لباس پہن کر اپنے اکلوتے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر پھر دہلی واپس آگیا۔ ؎

مرنجاں دل مشو خرم ✿ نہ گیتی در راحتِ رنج
که آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

آغا محمد نے ۱۷ ربیع الآخر ۷۳۹ھ بمطابق ۱۳۳۸ء سلطان محمد بن

تغلق کے زمانہ میں دہلی میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔

ملک معزالدین نے بڑے عزم وہمت سے زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ اور اس خاندان پر جو ادبار و مصائب کے بادل چھائے تھے۔ چھٹ گئے۔ آپ کے بیٹے ملک موسیٰ نے بڑی شہرت و عزت حاصل کی۔ مگر قسمت نے انہیں دہلی سے اٹھا کر ماوراءالنہر میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور کر دیا۔

جب تیمور نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کیا تو ملک موسیٰ انکی فوجوں کے ہمراہ پھر ہندوستان لوٹ آئے۔ اور تیموری دور میں آپ نے اپنی شجاعت اور جرأت میں بڑا نام پیدا کیا۔ ملک موسیٰ کے ایک بیٹے شیخ فیروز شاہی نے اپنی خداداد ذہانت اور اوصاف حمیدہ میں وہ شہرت و عظمت حاصل کی۔ کہ باید و شاید۔ شیخ محدث نے اپنی کتاب اخبار الاخیار میں آپ کے اخلاق و کردار پر بڑی بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

شیخ فیروز ۸۶۰ھ۔ ۱۴۵۵ء میں بہرائچ کے کسی معرکہ میں شہید ہوئے تو آپ کی شہادت کے چند ماہ بعد شیخ سعداللہ (شیخ محدثؒ کے دادا) پیدا ہوئے۔ شیخ سعداللہ اپنے زمانے کے ایک صاحب حال بزرگ شیخ محمد منگن ؒ (المتوفی ۹۰۰ھ) کے زیر تربیت رہ کر بڑے عالم، زاہد اور پاک طینت ولی کامل بن گئے۔ شیخ سعداللہ کے بیٹے شیخ سیف الدین حضرت شیخ محدث کے والد مکرم تھے۔ شیخ سیف الدین ابھی آٹھ سال کے بچے ہی تھے کہ والد مکرم کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔

۱۔ اخبار الاخیار ص ۲۸۹ ۲۔ اخبار الاخیار ص ۱۶۱ ۳۔ اخبار الاصفیاء ص ۲۹۱

اللہ تعالےٰ نے اس بچے میں بڑی علمی اور عملی خوبیاں بھر دی تھیں۔ وہ ایک صاحب دل بزرگ، اچھے شاعر، پُرلطف اور بذلہ سنج انسان تھے۔ لوگ ان کی ظرافت و لطافت، معاملہ فہمی اور خوش اسلوبی کے معترف تھے[1]۔ اگرچہ آپ عوام میں اپنے شعر سخن کی وجہ سے مشہور تھے۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک صاحب باطن اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ رسالۂ وصیت میں شیخ نے آپ کی باطنی زندگی پر بڑا تفصیلی نوٹ لکھا ہے۔

شیخ سیف الدینؒ دنیا سے بے تعلق رہتے آپ بقول حضرت محدثؒ قسم کھا کر فرمایا کرتے تھے کہ انہیں دنیا کی ثروت و اسباب غنا کے حاصل کرنے کا کبھی شوق پیدا نہیں ہوا۔ دل کو توجہ تھی تو فقر و محبت ہی کی طرف تھی[2]۔

شیخ سیف الدین حضرت شیخ امان اللہ پانی پتیؒ[3] رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے خرقہ خلافت حاصل کر لیا۔ اور سلوک و تصوف کی منزلیں طے کرنے لگے۔ شیخ سیف الدین شعر و سخن سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور سیفی تخلص کرتے تھے۔ آپ کی مثنوی "سلسلۃ الوصال" اور ایک رسالہ "مکاشفات" آپ کی سخن فہمی کی بہترین مثال ہیں۔

"شیخ سیف الدین اپنے زمانہ کے علمی معیار اور روایات کے مطابق کوئی جید عالم تو نہ تھے۔ لیکن وہ ان تمام اخلاقی خوبیوں کے مالک تھے۔ جو ایک جید عالم

۱۔ اخبار الاخیار ص ۲۹۲۔ ۲۔ اخبار الاخیار ص ۲۹۶۔ ۳۔ شیخ امان اللہ پانی پتی کا نام عبدالملک، لقب امان اللہ تھا۔ امام شیخ ابن عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود پر بڑا عقیدہ رکھتے تھے "علم تصوف و توحید" میں آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے اثبات الاحد اور "شرح لوائح جامی" کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ آپ اسرار توحید کو کھلم کھلا بیان فرماتے اور عشق حقیقی کی آگ میں تڑپتے تھے۔ آپ ۱۲۔ ربیع الآخر ۹۵۰ھ مطابق ۱۵۵۰ء واصل بحق ہوئے۔ (اخبار الاخیار ص ۲۲۳)

و متبحر فاضل کا حصہ ہوتی ہیں، طلب صادق، ایمان کامل، اعتقاد راسخ سچائی دیانت اور استغنا سب کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ اور علوم دینی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ آپ ۲۷ شعبان ۹۹۰ھ ۱۵۸۲ء کو واصل بحق ہوئے[۱]۔

شیخ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ علیہ ماہ محرم ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء دہلی میں پیدا ہوئے

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

یہ زمانہ اسلام شاہ سوری کی حکومت کا تھا۔ اس وقت مہدوی تحریک[۲] پورے عروج پر تھی۔ اور علمائے وقت کی جانب سے تکفیر و تضلیل کا کام بڑے زور و شور سے کیا جا رہا تھا۔ اس زمانہ میں مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری شیخ الاسلام آگرہ نے مہدیوں کی مخالفت پر کمر باندھی۔ اور سلیم شاہ نے بادشاہ کو ڈرایا کہ اگر اس تحریک کو ختم نہ کر دیا گیا۔ تو حکومت ہند پر ان کا قبضہ ہو جائیگا۔ شیخ علائی رحمۃ اللہ کا سلیم شاہ کے دربار میں بڑا مشہور معرکہ رہا۔ شیخ علائی نے دنیا پرست علماء کی خدمت میں سلیم شاہ کے دربار میں ایک تقریر کر کے بڑا اثر ڈالا پھر بھی وہ ان حضرات کی بالادستی سے جان نہ بچا سکے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد بڑی

---

(۱) اخبار الاخیار ص ۲۹۹ (۲) مہدوی تحریک کے بانی سید محمد جونپوری تھے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ تحریک احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کیلئے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ مہدوی فرقہ علمائے سو کی دنیا طلبی اور جاہل صوفیہ کی بدعات و منکرات سے سخت نالاں تھے اور ان کی کوشش تھی کہ یہ عناصر حکومت سے دور ہو جائیں تاکہ معاشرہ ان دنیا پرست مشائخ و علماء سے محفوظ ہو جائے۔ مگر انہیں بڑی مخالفت کا سامنا پڑا۔ مہدوی تحریک کے تفصیلی حالات کیلئے زاد المتقین (شیخ محدث) بیان مصطفیٰ (پروفیسر محمد شیرانی) تذکرہ (ابوالکلام آزاد) انوار العیون (قاسم سعید) جواہر التصدیق (شیخ مصطفیٰ گجراتی)......

بے دردی سے قتل کر دیئے گئے۔

اس واقعہ سے ہم شیخ کی پیدائش کے وقت دربار ی حالات اور معاشرتی زندگی کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں قدرت کی نیرنگیوں کا بڑا عجیب کرشمہ ہے کہ محرم میں اس برصغیر میں حضرت شیخ کا منات ارضی پر تشریف لاتے ہیں۔ تاکہ ان سے احیائے علوم دینیہ اور بقائے عقائد اسلامیہ کا کام لیا جائے۔ مگر اسی محرم میں ابوالفضل کی پیدائش ہوتی ہے۔ تاکہ وہ اسلامی شعائر کی تضحیک و توہین اور معاشرے میں بدعات و نواہی پھیلانے میں عمر صرف کر سکے۔ ایک نے اپنی زندگی دین محمدی کی خدمت میں تیار کر دی۔ اور دوسرے نے دین الٰہی کے قیام و اشاعت میں اپنی ذہنی اور علمی قوتیں لگا دیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور خیالات کی نشو و نما ان کے والد ماجد کا خاص حصہ تھا۔ یہ تین چار سال کا بچہ اور باپ کا یہ ذوق و شوق کہ شب و روز آغوش علم و تربیت میں لئے لحظہ بہ لحظہ محنت کر رہے ہیں[1] والد کی برسوں کی ریاضت نے جو ذہنی و قلبی کیفیات حاصل کی تھیں۔ بچے کے ذہن نشین کر رہے ہیں مسئلہ وحدت الوجود کے اسرار اسی دور میں ذہن نشین کر دیئے گئے۔ جب یہ ناپختہ ذہن اس ادق مسئلہ کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے سے قاصر رہتا۔ تو آپ تسلی دیتے کہ آہستہ آہستہ انشاءاللہ جمال یقین حاصل ہو گا[2]۔ والد محترم کی خاص نظر کرم کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانہ طفلی میں انہوں نے

۱۔ شب و روز در کنار مرحمت و جوار عنایت ایشاں تربیت می یافتم (اخبار الاخبار ص ۳۰)

۲۔ انشاءاللہ رفتہ رفتہ بمدہ از روئے کار بکشائد و جمال یقین روئے نماید (اخبار الاخبار ص ۳۰)

حضرات صوفیہ کے اقوال ازبر کرلئے خصوصاً تلقین علم توحید اور تحقیق مسئلہ وحدت الوجود میں شرف مکالمت عطا ہوتا۔ اور والد اس ترقی پر خوشی کا اظہار کرتے۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ آپ کے والد ماجد نے علمائے عصر کی بے راہ روی کج بحثی اور دنیا پرستی کی گمراہیوں کا قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ اسلئے اپنے بیٹے کو اس طرح نصیحت کرتے کہ وہ مستقبل میں ان مباحث میں نہ اُلجھ سکے۔ آپ علمی کاموں میں جنگ و جدل کے سخت خلاف تھے۔ البتہ افہام و تفہیم کو محبت اور شفقت کی روشنی میں پیش نظر رکھنے کی ہدایت کرتے۔ یہ چیزیں شیخ کی زندگی کا جزو لاینفک بن گئیں۔ شیخ کی زندگی میں اکبری دَور کے جو ہنگامے اور مباحثے ہوئے۔ اس میں شیخ ایک دن بھی نہیں اُلجھے۔ بلکہ اپنے علمی مسلک پر خاموشی سے کام کرتے چلے گئے۔

آپ کے والد ماجد نے سب سے پہلے شیخ کو قرآن پاک پڑھایا۔ اور کچھ سورتیں حروف تہجی کی شناخت سے پہلے ہی یاد کرادی گئیں۔ حتیٰ کہ دو تین ماہ میں پورا قرآن پاک یاد کروادیا[1]۔ لکھنے کی طرف آئے تو ایک دو ماہ میں قلم سے خوبصورت الفاظ نکلنے لگے۔ اتنے کم عرصہ میں شیخ کا لکھنا پڑھنا سیکھ لینا غیر معمولی ذہانت کا کرشمہ تھا[2]۔ شیخ نے اس کامیابی کو ہمیشہ اپنے والد کی مہربانی سے تعبیر کیا[3]۔ شیخ کو بوستان سعدی اور دیوان حافظ کے اکثر اشعار ازبر کرادیئے

۱۔ در دو سہ ماہ قرآن پاک ختم کردم (اخبار الاخیار ص ۳) ۲۔ در اندک مدت شاید اگر تحرا دیک ماہ تعین کنم۔ دروغ نگفتہ باشیم۔ کتابت و سلیقۂ النساء پیدا شد (اخبار الاخیار ص ۳۰۱)

۳۔ ہر چہ ہست از اثر توجہ و عنایت ایشان ست (اخبار الاخیار ص ۳۰۱)

گئے۔ قرآن کے بعد میزان شروع کرا دی۔ اور مصباح اور کافیہ تک والد ماجد خود تعلیم دیتے گئے۔ پڑھاتے وقت حوصلہ افزائی کے طور پر فرمایا کرتے تم بہت جلد عالم بن جاؤ گے[1]۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں آپ نے شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھ لی، پندرہ سولہ سال میں مختصر اور مطول سے فارغ ہو گئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں معقولات و منقولات کا کوئی گوشہ نہ تھا جس پہ شیخ کی نظر نہ پہنچی۔

تحصیل علم کے ساتھ شیخ میں حصول مطالب کا جو جذبہ پیدا ہو گیا تھا وہ آپ کو دن رات بے چین رکھتا۔ زندگی کی ساری دلچسپیاں سمٹ کر اسی جذبہ میں جمع ہو گئی تھی۔ ان کے سامنے بجز تحصیل علم دوسری کوئی چیز ہی نہ تھی[2]۔ ابوالفضل نے اگر رات کو پڑھتے پڑھتے اپنے دماغ میں خشکی پیدا کر لی تھی[3] تو شیخ محدث نے بارہا مطالعہ کی مشغولیت میں اپنے بالوں اپنے عمامہ کو چراغ سے جلایا ہے۔ وہ بھی اس انہماک سے کہ آگ لگنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ "اخبار الاخیار" میں فرماتے ہیں۔

چہ دودہائے چراغ کہ در دماغ نرفت
کدام بادہ محنت کہ در ایاغ نرفت

کدام خواب و چہ آسائش و کجا آرام!
چہ خار خار کہ در بستر فراغ نرفت

بجیر تم زدل خود کہ عمر رفت ولے
ز کنج عمکدہ ہرگز بہ صحن باغ نرفت

آپ نے جس ریاضت اور محنت شاقہ سے تحصیل علم کی۔ اس کی تفصیل آپ

---

[1]۔ ان شاء اللہ تو زود دانشمند شوی۔ (اخبار الاخیار ص۳۰۱) [2]۔ از ابتدائے ایام طفولیت نمی دانم کہ بازی چیست۔ خواب کدام۔ مصاحبت کیست۔ و آرام چہ۔ و آسائش کو۔ و سیر کجا

شبہا خواب چہ و سکوں کدام است
خود خواب بما شغال حرام است (اخبار الاخیار ص۳۰۲)

[3]۔ دود چراغ خوردہ بشب آوردہ ام بروز
معذورم از نماند دماغ حرارتی (ابوالفضل)

کی کتاب اخبار الاخیار میں ملتی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ نے مطالعہ۔ بحث و تکرار، اور کتابت کے مراحل کو کس جگر سوزی اور دیدہ ریزی سے سر کیا۔

عربی میں کامل دستگاہ اور علم کلام منطق پر پورا عبور حاصل کرنے کے بعد شیخ دانشمندان ماوراء النہر سے اکتساب علم کرتے رہے۔ اگرچہ ہمیں ان بزرگوں کے نام نہیں بتائے، تاہم یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ نے کتابی علوم حاصل کرنے میں۔ رات دن کس انہماک سے کام کیا۔ اخبار الاخیار کی تصنیف کے وقت نہایت حسرت سے ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں۔

"اگر آں قدر ذوق و شوق در طلب مولیٰ در یاضت باطن می بود تاکار بکجا می کشید" (اخبار الاخیار ص ۳۰۲)

شیخ نے کتابی علم کے ساتھ "عنت قلب و نگاہ" کا پورا خیال رکھا ان کے والد ماجد نے ہدایت کی تھی کہ

"ملائے خشک و ناہموار نباشی" (اخبار الاخیار ص ۳۰۳)

عمر بھر ان کے ایک ہاتھ میں "جام شریعت" رہا۔ اور دوسرے میں "سندان عشق" اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے "جام و سندان" سے بکمال خوبی کام لیا۔ وہ طالب علمی میں عبادت الٰہی کے مزے شب بیداری میں حاصل کرتے ذوق و شوق سے دعائے نیم شبی سے اپنے دامن مراد کو رحمت خداوندی سے بھرتے اس کے تصور سے پیرانہ سالی میں بھی کام و دہن کو لطف اندوز رکھتے "ہنوز ذوق آں اسحار و اوقات در کام وقت پیدا است"

اس زمانہ میں آپ کو علماء و مشائخ کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کی علمی

وروحانی فیضان سے بہرہ ور ہونے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے مذہبی خیالات اور پاکیزگیٔ نفس کے پیشِ نظر ان حضرات کے لطف و کرم کا مرکز بن گئے تھے شیخ اسحاق (المتوفی ۹۸۹ھ) سہروردیہ سلسلہ کے مشہور بزرگ تھے۔ ملتان سے دہلی آکر قیام پذیر ہوئے۔ وہ نہایت ہی کم گو اور تجرد پسند بزرگ تھے۔ مگر جب شیخ محدثؒ انکی خدمت میں حاضر ہوتے تو بے حد التفات و کرم فرمایا کرتے۔

بفقیر سخنانِ بسیار کردہ (اخبار الاخیار ص ۲۷۱)

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں یہ شیخ محدثؒ نے ابتدائی عمر میں ہی تکمیلِ علم کر لی تھی۔ عبدالحمید لاہوری کے بیان کے مطابق آپ نے فراغت علم کے بعد (الحج بیت اللہ کو روانگی سے قبل) بیس سال کی عمر میں درس و تدریس کا کام شروع کر دیا تھا۔ درس و تدریس کے دوران ہی بارگاہِ رسالت سے پیغام رحمت آپہنچا۔ اس نعمتِ عظمیٰ کا ذکر کتنے خوش بیان الفاظ میں کرتے ہیں

"چارہ گر بیچارگاں و راہ نمائے آوارگاں مرا بجانب خود طلبید و من بے خانماں را سلسلۂ شوق در گردن افگندہ۔ بسوئے خانہ خود کشید من نامراد را بمنزل مراد رسانید یعنی بدرگاہ حبیب خود صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جائے داد" (اخبار الاخیار ص ۳۰۲)۔

۹۹۶ھ مطابق ۱۵۸۷ء میں جب آپ کی عمر اڑتیس سال تھی۔ حجاز کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ کے سفر حجاز کا ایک واقعہ آپ کے رسالہ صلوٰۃ الاسرار میں یوں درج ہے۔[۲]

---

[۱] بادشاہ نامہ حصہ دوم ص ۳۴۳-۳۴۴ -۲ ، رام پور میں قلمی نسخہ ص ۳ تا ۵

"میرے شریک سفر ایک قادری بزرگ درویش تھے۔ صبح کو جب جہاز کا لنگر اٹھایا جاتا تھا۔ یہ درویش جہاز کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا یا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ زور زور سے پکارتا۔ مجھے اس کی یہ صدا بڑی بھلی لگتی ہے"

آپ رمضان سے کافی عرصہ پہلے مکہ معظمہ پہنچے۔ رمضان ۹۹۲ھ میں انہوں نے مکہ معظمہ کے محدثین سے صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا درس لیا۔ پھر حضرت شیخ عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے۔

آپ جب دیارِ حجاز میں رہے۔ شیخ عبدالوہاب متقی[۱] کی صحبت میں اکثر وقت گزارا۔ یہیں سے آپ نے علوم حدیث کے ساتھ ساتھ احسان و سلوک کی منزلیں طے کیں۔ یہ شیخ کی خوش قسمتی تھی۔ کہ دیارِ حبیبؐ میں آپ کو ایک ایسا مردِ کامل

۱۔ شیخ عبدالوہاب متقی ہندوستان کے ان عدیم المثال علمائے احناف میں سے تھے جنہوں نے مکہ معظمہ میں بیٹھ کر اپنے علمی تبحر کا سکہ حجاز و یمن، مصر و شام سے منوایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ حجر مکی الہیتمی اور ملا علی قاری الہروی ایسے بلند پایہ محدثین بھی تنزیل مکہ تھے آپ منڈو (مالوہ) میں پیدا ہوئے، آپ کے والد شیخ ولی اللہ ریاست کے اعیان میں سے تھے۔ مگر بعض سیاسی حالات کے پیش نظر آپ برہان پور میں قیام پذیر ہوگئے۔ شیخ عبدالوہاب ابھی بچے ہی تھے۔ کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور آپ نہایت بے سروسامانی کے عالم میں گجرات۔ دکن۔ لنکا۔ سراندیپ وغیرہ میں پھرتے رہے۔ اس سفر کے دوران اگر کوئی قبلہ علم یا خضر طریقت مل جاتا تو آستانہ پر چند روز قیام کر لیتے ورنہ سفر ہی وسیلہ ظفر تھا۔ آپ اسی سیاحت کے دوران مکہ معظمہ پہنچے اور ۹۶۳ھ مطابق ۱۵۵۵ء میں جب آپ کی عمر بیس سال تھی شیخ علی متقی رحمۃ اللہ کی صحبت میں حاضر ہوئے۔ آپ اس صحبت سے اسوقت اٹھے جب ذرہ سے آفتاب بن گئے۔ شیخ علی متقی نے پہلے تو آپ میں یکسوئی پیدا کی اور آپ کو کتابت کی صبر آزما ریاضت میں لگا دیا (باقی ص ۱۷ پر)

مل گیا جس کی نظر کیمیا اثر نے آپ کے علمی دھاروں کا رُخ روحانیت اور طریقت کی طرف پھیر دیا۔ اور علمی صلاحیتوں کو صحیح راہ پر لگا دیا۔

شیخ محدث ؒ نے اپنے استاد شیخ عبدالوہاب متقی ؒ کے عقائد اور روحانی خیالات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ آپ اختلافی مسائل میں سلامت روی کی روش کے قائل تھے۔ مذہبی انتشار میں وہ عقائد اہل سنت و جماعت پر مضبوطی سے چلنے کی ہدایت فرمایا کرتے۔ کیونکہ ان کے ہاں یہ عقیدہ افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کرنا تھا۔ علمائے وقت کے مشغل تکفیر و تذلیل سے نفرت کرتے تھے۔ اور لوگوں کی معمولی لغزشوں کو فتووں کی زد میں لانے سے منع فرمایا کرتے سماع کے متعلق عزیزوں کو اجازت نہ دیتے تھے۔ مگر مشائخ کے قبول سماع پر حرف گیری نہ کرتے۔ علم کو بمنزلہ غذا تصور کرتے تھے۔ ان خیالات نے شیخ کی تربیت پر بڑا خوشگوار اثر ڈالا۔ آپ نے شیخ سے باقاعدہ مشکوٰۃ شریف کا سبق شروع کیا۔ رمضان کے آخری دس دنوں میں آپ کے ساتھ اعتکاف کیا اور صحبت روحانیہ سے مستفید ہوتے۔ ۲۳۔ ربیع الثانی ۹۹۷ھ میں شیخ کی اجازت سے مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے۔ آخر رجب ۹۹۸ھ تک وہاں مقیم رہے۔ پھر مکہ میں آکر درس مشکوٰۃ مکمل کیا۔ آپ نے شیخ کی خدمت میں رہ کر حدیث۔ تصوف۔ فقہ حنفی۔ اور

بقیہ ص ۱۶ ۔ جب ان کے ذہن میں ٹھہراؤ آگیا تو آپ نے تحصیل علم کے دروازے کھول دیئے۔ ۹۷۵ھ میں جب شیخ علی متقی کا انتقال ہوا تو آپ اپنے استاد کے صحیح طور پر علمی جانشین مقرر ہوئے۔ اور مکہ میں ایسا علمی مرکز قائم کیا۔ جس کی شہرت نے دنیائے اسلام سے طالبعلموں کھینچ لیا۔ شیخ عبدالوہاب متقی نے حضرت شیخ محدثؒ کی تعلیم و تربیت میں بڑی جانفشانی سے کام لیا۔ اور روحانی تربیت میں آپکو سلسلہائے چشتیہ قادریہ شاذلیہ اور مدنیہ میں خلافت عنایت فرمائی

اور حقوق العباد کے موضوعات کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔

مدینہ منورہ کا قیام شیخ محدثؒ کیلئے قلب و نظر کی دولتوں کے حصول کا بہت بڑا اچھا موقع ہے۔ آپ نے اپنے آقا و مولا حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں اپنا مشہور قصیدہ پیش کیا۔ زاد المتقین میں لکھا ہے جب اس شعر پر پہنچے ؎ خرابم از غم ہجر جمالت یا رسول اللہ

جمال خود نما رحمے بجان زار شیدا کن

تو دل بے قابو ہوگیا۔ اور بقول خود

"گریہ زار زار در گرفت"

خلوص وعقیدت کا یہ والہانہ تقاضہ قبول ہوا۔ اور وہ زیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے۔ آپ قیام حجاز میں چار بار دولت زیارت سے محظوظ ہوئے۔ ۲۱۔ ذی الحجہ ۹۹۸ھ کو آپ نے مکہ معظمہ میں جو خواب دیکھا اسے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"دیدم کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بر سریرے نشستہ۔ و ربی علم حدیث میفرمایند و انوار جمال و جلال از وجہ شریف وے متلالی است و بآں صورت متجلی است کہ فوق آں تصور نتواں کرد۔"

اس خواب نے آپ کو حدیث کی تشریح و تدریس کا بے پناہ جذبہ بخشا۔ اور آپ نے ساری زندگی اس کام کے لئے وقف کر دی۔

ع ا۔ اس قصیدہ کا مطلع یہ ہے

بیا اے دل قدمے از ہستی خود ترک دعوی کن ... میفگن چشم بر صورت نظر در عین معنی کن

علم و عمل کی وادیاں طے کرانے کے بعد شیخ عبدالوہاب متقیؒ نے شیخ عبدالحق محدثؒ کو ہندوستان جانے کی ہدایت کی، اور پورے اصرار سے آپ کو واپسی پر آمادہ کیا۔ آپ شوال ۹۹۹ھ کو عازم ہندوستان ہوئے۔ آپ تین سال کے بعد جب اپنے وطن کو لوٹے تو یوں محسوس کر رہے تھے کہ جیسے وہ عزیز ترین دولت سے محروم ہو گئے ہیں۔

حجاز سے واپسی پر شیخ محدثؒ نے مسند درس و ارشاد بچھا دی۔ شمالی ہندوستان میں اس زمانہ میں یہ پہلا مدرسہ تھا، جہاں سے شریعت و سنّت کی آواز بلند ہوئی۔ حالانکہ جو ماحول دنیا پرست علماء کی بدولت ہندوستان کی معاشرتی زندگی کا ہو چکا تھا۔ اس میں کتاب و سنت کی تعلیم تو کجا۔ خدا و رسول کا نام بھی بصد استہزا لیا جانے لگا تھا۔ شیخ نے بڑی پامردی سے ان تمام بدعات کا مقابلہ کیا، جنہیں دربار اکبری کی سرپرستی حاصل تھی۔ مذہبی گمراہیوں کے بادل چاروں طرف امنڈ آئے تھے۔ مخالف طاقتیں بار بار اس دار العلوم کے بام و در سے آ ٹکرائیں لیکن شیخ محدثؒ کے پائے اثبات میں ذرہ بھر بھی لغزش نہ آئی۔

آپ نے علمی اور تدریسی کام کرنے میں جس انہماک سے حصہ لیا اس کے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ آپ نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اصلاح احوال کی عملی کوشش کی اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کا قلوب و اذہان میں وقار پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

شیخ محدثؒ نے منازل سلوک و طریقت طے کرنے کیلئے وقت کی روحانی شخصیتوں سے استفادہ کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کی، سب سے پہلے آپ نے والد ماجد سے

فیض حاصل کیا۔ پھر حضرت موسیٰ گیلانیؒ ابن مخدوم سید حامد گیلانیؒ (گنج بخش، المتوفی ۹۷۸ھ ۱۵۷۰ء سے۔ اور پھر شیخ عبدالوہاب متقی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سے پوری توجہ سے روحانی علوم حاصل کئے۔ حضرت باقی باللہ نقشبندیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ نے بڑا فیض پایا۔ حضرت باقی باللہؒ نے ایک طرف تو حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسا مرید باہمت پیدا کیا، اور دوسری طرف شیخ محدثؒ کو اس طرح تابناک کیا۔ کہ شرق و غرب میں آپ کے ذریعہ علم کی ضیا پاشیاں پہنچیں آپ کے "المکاتیب و الرسائل" میں تقریباً سات مکاتیب ہیں۔ جو آپ نے حضرت باقی باللہؒ کو لکھ کر دعائیں لیں، حضرت خواجہ آپ پر حد سے زیادہ شفقت فرمایا کرتے اور آپ ہی کا علمی احترام بھی یہاں تک روا رکھتے، کہ آپ کو فخر ہوتا۔ آپ نے دہلی میں قادریہ چشتیہ۔ شاذلیہ۔ مدنیہ اور نقشبندیہ سلسلوں سے علیحدہ علیحدہ روحانی فیض پایا۔ آپ قلبی طور پر حضرت شیخ سید عبدالقادر گیلانی رضی اللہ عنہ کے عاشقِ زار تھے۔ اور آپ کے نام کا وظیفہ تو زندگی کا معمول تھا۔

۲۱۔ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو یہ آفتاب علم و کمال چورانوے سال کی عمر میں غروب ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

آپ کے جسد خاکی کو آپ کی وصیت کے مطابق حوض شمسی کے کنارے ہی سپرد خاک کر دیا گیا۔ تاریخ ولادت "شیخ اولیاء" ۹۵۸ھ ہے۔ اور تاریخ رحلت "فخر عالم" ۱۰۵۲ھ ہے۔

۱۰۲۱ھ

تصانیف

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر کا بیشتر حصہ تالیف و

۱۰۵۲ھ
غلط چھپا ہے

تصنیف میں گذرا۔ جس جوش و خروش سے انہوں نے جوانی میں کام شروع کیا اسی جذبہ اور ہمت کے ساتھ پیرانہ سالی میں کام کرتے رہے۔ عبدالحمید لاہوری محمد صالح کنبوہ اور خافی خان نے آپ کی تصانیف کی تعداد سو سے کچھ زیادہ بتائی ہے۔ مگر شیخ نے اپنی کتاب "تالیف قلب الالیف بذکر فہرس التوالیف" میں ۴۹ تعداد بتائی ہے۔ مگر آپ کی کتاب "الرسائل والمکاتیب" جو ۸۴ رسائل پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ہے۔

جیسا کہ آپ نے "کتاب الرسائل" میں لکھا ہے کہ وہ اس بات پر مامور تھے کہ سوائے سنت و شریعت کے کسی موضوع پر گفتگو نہ کریں۔ چنانچہ ساری علمی اور ادبی کاوشوں کا محور و مرکز شریعت و سنت ہی رہا۔ موضوع کے اعتبار سے شیخ کی تصانیف کو مندرجہ ذیل عنوان دیئے جا سکتے ہیں۔

(۱) تفسیر	(۲) تجوید	(۳) حدیث	(۴) عقائد
(۵) فقہ	(۶) تصوف	(۷) اخلاق	(۸) اعمال
(۹) فلسفہ و منطق	(۱۰) تاریخ	(۱۱) سیر	(۱۲) نحو
(۱۳) ذاتی حالات	(۱۴) خطبات	(۱۵) مکاتیب	

جب ہم غور کرتے ہیں کہ ایک ہی قلم سے اتنے موضوعات پر اس قدر گراں قدر تصانیف بر آمد ہوئیں۔ تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ اور برملا یہ کہنا پڑتا ہے۔

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

آج تک مندرجہ ذیل کتب زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

(۱) اخبار الاخیار فی احوال الابرار۔ (۲) آداب الصالحین۔

(۳) آداب اللباس۔ (۴) اشعۃ اللمعات فی شرح مشکوۃ۔

(۵) ترجمہ زبدۃ الآثار منتخب بہجۃ الاسرار۔

(۶) تکمیل الایمان و تقویت الایمان۔

(۷) توصیل المرید الی المراد بہ بیان الاحزاب والاوراد۔

(۸) جاذب القلوب الی دیار المحبوب (۹) جواب بعض کلمات شیخ احمد سرہندیؒ

(۱۰) شرح سفر السعادت (۱۱) شرح فتوح الغیب

(۱۲) فہرس التوالیف (تالیف قلب الالیف)

(۱۳) ماثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ (۱۴) مدارج النبوۃ۔

(۱۵) مَرج البحرین (۱۶) نکات الحق والحقیقتؒ

زیر نظر کتاب "مَرج البحرین فی الجمع الطریقین" شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ کی تصوف کی ان کتابوں میں سے ایک بلند پایہ اور گراں قدر کتاب ہے جسے اہلِ ذوق نے بڑی محبت سے پڑھا۔ آپ خود اس کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

"ایں رسالہ ایست مسمّٰی بہ مَرج البحرین و جامع الطریقین۔ جامع طریقہ فقہ، تصوف، شریعت و طریقت و ظاہر و باطن و صورت و معنی و قشر و لب، علم و حال و صحو و سکر و مذہب و مشرب عقل و عشق

---

(۱)۔ غیر مطبوعہ کتب کے نام "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی کے ص ۲۱۶ تا ص ۲۱۹۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اگر آنرا صراط مستقیم و طریق قویم نام کنند جائز باشد۔ دین خالص و سبیل السلم لقبش نهند روا باشد۔ و دعوت حق و نهج ارشاد گویند راست افتد۔ میزان عدل و دستور العمل گردانند درست آید۔"

اس کتاب کی تصنیف سے شیخ محدثؒ کا مقصد یہ تھا کہ " فقیہ محب مستشرف احوال و صوفی محقق مقید با اعمال " ہو۔ کتاب تیرہ وصال (ابواب) پر مشتمل ہے۔

آپ نے اس مفید اور اہم کتاب میں اہل فقہ اور ارباب حال کے مابین جو ظاہری اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا ہے۔ ارباب طریقت اور علمائے شریعت کی علمی اور روحانی کشمکش میں صحیح راہیں تلاش کر کے فریقین کے حدود و مقامات سے آگاہی بخشی ہے۔ رموز تصوف کو علم و خرد کی روشنی میں حل کیا ہے۔ اور یونانی فلسفہ اور علم کلام کے تمام الجھاؤ کو دفع کرنے میں بڑا اہم کام کیا ہے۔ صوفیائے کرام خاص کر اصحاب حال و سکر اور علمائے ظاہر میں جو اختلافات چلے آتے ہیں۔ انہیں تاریخی روشنی میں نکھار کر رکھ دیا۔

کتاب کے آخری حصہ میں حضرت شیخ سید احمد مغربی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف " قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ " کا ترجمہ اور خلاصہ پیش کر کے کتاب کی افادیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ اور ناظرین کتاب پر یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ متقدمین نے ان مسائل کے حل کرنیکی کس انداز میں کوشش کی ہے۔

مَرج البحرین ۱۲۶۵ھ میں مطبع عبدالرحمٰن سے اور ۱۲۷۲ھ میں مطبع محمدی کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ۱۳۱۳ھ میں مطبع نامی لکھنؤ سے اس کا ترجمہ شائع ہوا اُردو ترجمہ مولوی غوث محمد فرخ آبادی نے کیا تھا۔ (یہ ترجمہ بھی ہماری نظر سے گذرا ہے[1]) مولوی شیخ عبدالقادر صدیقی نے اس کی شرح فارسی زبان میں "شرح البحرین" کے نام سے کی تھی۔ اس کا قلمی نسخہ آصفیہ کتب خانہ میں موجود ہے (جلد اول ص ۴۴۶) بانکی پور کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ جس کی تصحیح خود حضرت شیخ نے فرمائی ہے۔

"مَرج البحرین" گو مختصر کتاب ہے، لیکن افادیت میں بڑی بیش بہا ہے شیخ محدث نے شریعت و طریقت۔ تصوف اور فقہ۔ علم اور عقل پر نہایت دل نشیں انداز میں بحث کی ہے۔ قرآن پاک۔ احادیث نبوی اور کتب تصوف کے بے شمار حوالے درج ہیں۔ مضمون کی خشکی کو شیخ کے شگفتہ انداز بیان اور برمحل فارسی اشعار کے استعمال نے حیرت انگیز حد تک دُور کر دیا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت ہمارے سامنے ۱۲۶۵ھ کا قدیم مطبوعہ نسخہ رہا۔ یہ فارسی نسخہ (ہمارے خیال میں اوّلیں مطبوعہ ہے) جو "باہتمام عبدالرحمان ولد حاجی محمد روشن خان عشرۂ اول جمادی الآخرہ ۱۲۶۵ھ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اور اسے محمد نہال الدین سوری کاکوری نے بڑے

---

[1] یہ ترجمہ حضرت مولانا مولوی محمد نبی بخش حلوائی (مؤلف تفسیر نبوی پنجابی) کے کتب خانہ واقع مکتبہ نبویہ جامع مسجد کوتوالی لاہور میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ باہتمام قطب الدین احمد پہلی دفعہ ماہ شوال ۱۳۱۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۸۹۷ء مطبع نامی لکھنؤ میں چھپا۔ ترجمہ پرانے اُردو لفظی انداز میں کیا گیا ہے۔ اکثر مطالب ترجمہ کے لفظی بوجھ میں دب کر رہ گئے ہیں۔

گراں قدر حواشی سے ترتیب دیا تھا۔ سوری کاکوری مولوی شیخ محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ مصنف شرح فارسی رسالہ شاطبی (المعروف حضرت بنگی من اللہ) خلیفہ مخدوم شیخ سعد خیرآبادی کی اولاد میں سے تھے۔ اس کتاب کو بڑے ستھرے خط میں بڑی تقطیع کے ۶۲ صفحات پر عبدالرحمٰن نے اس وقت زیورِ طبع سے آراستہ کیا جب وہ سررشتہ دارِ عدالت صدر الصدور ضلع فتح پور تھے۔

اس سلسلہ میں ہمیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات فارسی میں سے بھی ایک قدیم قلمی نسخہ ملا۔ یہ مخطوطہ اپنی قدامت کے لحاظ سے ان تمام نسخوں میں سے (جو ہماری نظر سے گذرے ہیں) مصنف کی زندگی کے قریبی ماخذ میں سے دکھائی دیتا ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۱۹۰ھ میں بدست محمد لال ضبطِ تحریر میں آیا۔ یہ چھوٹی تقطیع ۲۲×۱۸/۸ میں بڑے خستہ کاغذ پر لکھا ہے۔ خط اگرچہ فنِ خوش نویسی کا عمدہ نمونہ نہیں مگر صاف اور شستہ قلم میں لکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے مطالعہ میں کسی قسم کی دشواری یا گرانی محسوس نہیں ہوتی۔

اس کتاب کی اشاعت و ترتیب کی ہمیں ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ یہ وہ سوال جو مدتوں ہمارے ذہن میں آتا رہا۔ اور اکثر قارئین کے سامنے مکتبہ نبویہ کا علمی بورڈ اس احساس کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ کہ موجودہ دور میں "دینِ الٰہی"، "فتنہ الفی"، "فتنہ انکارِ حدیث" سے مہلک تر نظریاتی اور فکری مباحث سر

۱۔ پنجاب یونیورسٹی میں لائبریری (حافظ محمود شیرانی)۔

۲۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔ فہرست مخطوطات حافظ محمود شیرانی۔ ۱۹۴۲ء۔

اُٹھائے ہیں۔ انگریز نے جونہی ہمارے اذہان و افکار سے گرفت ڈھیلی کی ایک طبقہ نے اس کی جگہ لی۔ جو اسی طرزِ فکر سے سوچنے کا عادی تھا چنانچہ ان لوگوں نے بھی ملّتِ اسلامیہ کی وحدتِ فکری کو اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ تصور کیا۔ چونکہ ان لوگوں کا اسلام کے ساتھ تعلق اتنا ہی لگاؤ تھا کہ جب کوئی مصیبت آئی۔ اسلام کا نام لے لیا۔ جب مصیبت دُور ہوتی تو اسلام کو محض فلسفہ خیال کی حیثیت دیدی۔ تقسیمِ ملک کی ہنگامہ خیزیوں میں اسلام ہماری پناہ تھا۔ پاک و ہند جنگ میں اسلام کا جہاد ہمارا محافظ و ناصر رہا مگر جونہی امتحان کے دن گذر گئے تو اسلام پھر ابن الوقتوں کے رحم و کرم پر چلا آیا۔ علی وجہ البصیرت یہ محسوس کرتے ہیں کہ ملّتِ اسلامیہ کو مجدد الف ثانیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تعلیمات ہی ان فکری طوفانوں سے بچا سکتی ہیں۔ اندریں حالات تصوف اور شریعت کے حسین امتزاج کو وجہ نزاع بنانے والوں کے لئے "مرج البحرین" ایک بہترین مصالحت کنندہ ہے۔ ان بیماریوں کا بہترین مصالح ہے۔ ان نوآموزانِ علم کیلئے بہترین استاد ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس ذہنی انتشار اور قلبی اضطراب کے زمانہ کے خستہ دلوں کے لئے مرہم، دم توڑتے عقیدوں کے لئے مسیحا اور بے سہارا نظریات کے لئے بڑا سہارا ہے۔ اہلِ دل حرزِ جان بنائیں گے۔ اہلِ علم اسے اپنی تشنہ کامی کا سامان پائیں گے۔ اہلِ تحقیق اسے اکبری دور کی معاشرتی اصلاح کی دستاویز کی حیثیت سے مطالعہ کریں گے اور صوفیاء اسے تصوف کے رموز و اسرار کے ترجمان کی حیثیت

سے دیکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہماری ان کوششوں کو قبول فرما کر ملتِ پاکستانیہ کے فکر و عمل میں روشنی بخشے۔

خادم العلماء والاصفیاءؒ

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی ایم۔ اے۔

جامع سنی۔ کوتوالی۔ لاہور

مرج البحرین

مصنّفہ

حضرت شیخ عبدالحقؒ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ

سید المرسلین وامام المتقین وخاتم النبیین وعلیٰ

اصحابہ واتباعہ واجزائہ اجمعین

فقیر عبد الحق بن سیف الدین دہلوی قادری عرض گذار ہے کہ یہ کتاب المسمیٰ بہ "مرج البحرین" جامع الطریقین ہے۔ یہاں فقہ و تصوف کی مختلف راہیں ملتی ہیں۔ شریعت و طریقت کے جدا جدا راستے یکجا ہو جاتے ہیں۔ گویا یہ ظاہر و باطن، صورت و معنی، پوست و مغز، علم و حال غرضیکہ خرد و جنوں کی علیحدہ علیحدہ شاہراہوں کا سنگھم ہے۔ اگر اسے صراطِ مستقیم یا طریقِ قویم کہا جائے تو درست ہو گا۔ دینِ خالص اور سبیل السلم کہا جائے تو بجا ہو گا۔ دعوتِ حق و منہج رشد کہیں تو واجب ہے الغرض اسے میزان العدل یا دستور العمل نام دیا جائے۔ تو بے جا نہ ہو گا۔ حقیقت میں یہ کتاب عالمِ دین کو تصوف کی حلاوت بخشتی ہے۔ صوفی طریقت کو رموزِ فقہ سے آگاہ کرتی ہے۔ اور مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ کی منہ بولتی تصویر ہے۔

کارِ ہر ظرفے نباشد عشق پنہاں داشتن — سہل کارے نیست تا خگر در گریباں ساختن

در کفِ جامِ شریعت در کفِ سندانِ عشق — ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے احباب کو اپنے امن و حفاظت میں رکھے!

اور مرکزِ حق اور مقصدِ صدق پر قائم و ثابت قدم رکھے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ وصلی اللہ علٰی سید الرسل و امام الکل واستاذ الوجود وھادی الخلق محمدٍ وّاٰلہٖ وَاَصحابہٖ اجمعین۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائیگی۔ ہر فرقہ مختلف اعتقادی اور نظریاتی راہیں اختیار کرے گا۔ ان اعتقادی و نظریاتی اختلافات کے پیش نظر ہر فرقہ ایک دوسرے سے دُور ہوتا جائیگا۔ حتیٰ کہ ان میں سے بہتر فرقے اپنی گمراہی و بد اعتقادی کی وجہ سے جہنمی ہوں گے۔ اور اس وقت تک جہنم کی سختیاں برداشت کرتے رہیں گے۔ جب تک اللہ چاہے گا۔ ان میں سے ایک فرقہ اپنے خلوص و حسن اعتقاد کی بدولت نجات یافتہ ہو گا۔ آپ سے دریافت کیا گیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہ کونسا فرقہ ہو گا۔ آپ نے فرمایا۔ جو میرے مذہب اور میرے صحابہ کے مذہب پر عمل پیرا ہو گا جس فرقہ کے متعلق حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا۔ وہ اہلِ سنت و جماعت ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ دین و عقیدت میں سنت رسولؐ و اعمال صحابہ کے پیروکار ہیں۔ اور اپنی عقل پر اعتماد کرنے کی بجائے خدا و رسولؐ کی بتائی ہوئی راہوں پر چلنے کو ہی حاصل زندگی خیال کرتے ہیں۔ ان بہتر فرقوں کو اہلِ بدعت و ضلالت اہل ہوا و اہل قبلہ کہا جاتا ہے۔ مگر (میرے نزدیک،

اس بدعت وضلالت کے باوجود وہ کافر نہیں ہیں۔ اور نہ ہی دائرۂ اسلام سے باہر ہیں۔ کیونکہ وہ اہلِ سنت وجماعت سے ہر مسئلہ میں انحراف نہیں کرتے۔ بلکہ بعض مسائل وعقائد میں غلو کر جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے بعض آیات واحادیث کے معانی بعض تاویلات سے بدل لئے ہیں۔ اور راہِ سنت سے انحراف کرلیا ہے۔

اندریں حالات ہمیں یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ کفر اور ضلالت میں فرق محض اسی قدر ہے۔ جس طرح ایک ہی قافلے کے لوگ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے مشرق کا رُخ کریں۔ اور اثنائے راہ میں بعض ہمراہی شمال وجنوب کو روانہ ہو جائیں۔ اور تاویل کرلیں کہ اس راہ سے ہم اپنی منزل پر جلد ہی پہنچ جائیں گے۔ مگر جوں جوں وہ بڑھتے گئے۔ صحیح راستے سے دُور ہوتے گئے۔ وہ یوں آوارہ پھرتے رہے۔ ہزاروں مصائب اور تکالیف برداشت کرنے کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ مگر بعض ایسے بھی ہیں۔ جو ابھی بے راہ روی میں راہِ راست کو نہ پاسکے۔ اور ہلاک ہو گئے اور بعض ٹھوکریں کھانے کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ اس قسم کے لوگ اہلِ ضلالت کہلاتے ہیں۔

جنگِ ہفتاد دو ملت ہمہ را عذر بنہ چوں ندانند حقیقت رہ افسانہ زدند

اسلام کے ان بہتّر فرقوں کا باہمی نزاع اور جنگ و اختلاف ایک قابل قبول عذر ہے۔ انہیں مطعون نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ حقیقت حال معلوم کرنے میں ناکام رہے۔ حکایات گذشتہ اور حالاتِ وارفتہ پر اکتفا کرکے بیٹھ

گئے۔ اور نادانی سے باہم نزاع و اختلاف کرنے لگے۔ مگر جن لوگوں نے مطلقاً مشرق کی بجائے اپنا رُخ مغرب کو کر کے اپنی منزلِ مقصود ہی جداگانہ بنالی نہیں کافر کہا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی مہربانیوں اور عنایتوں سے ہدایت پر رکھے۔

وصالِ اوّل

دنیا و مافیہا سے محبت

دنیا کی محبت۔ عقل کی اتباع اور نفس کی اطاعت۔ کفر و ضلالت کا سبب بن جاتی ہے۔ حُبُّ الدُّنیا رأسُ کُلِّ خَطِیئَۃٍ (دُنیا کی محبت تمام خطاؤں کا سرچشمہ ہے) بعض لوگ دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہوتے ہیں کہ ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ادائے فرض اتباعِ سنت اور نوافل سے بھی قاصر ہو جاتے ہیں اور انہیں استقامتِ دین کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔

اہلِ دنیا کا یہ قاعدہ ہے کہ جس طریقہ سے مال و دولت اور ظاہری عزت و وقار حاصل ہو۔ اسی کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ نفس و شیطان انہیں اپنا ہم طبع و معتقد بنا لیتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لوگ اپنی عقل و دانش میں غرورِ نفس پر اعتماد کر کے اپنی بدکرداری پر ہی مسرور و مطمئن نظر آنے لگتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ کفرِ حقیقت کی ساری راہوں کو جانتے ہوئے یعنی نفس امارہ کے زیرِ فرمان زندگی بسر کرتے

چلے جاتے ہیں۔ اپنے عیب کو عیب نہیں سمجھتے کسی الزام کو الزام نہیں گردانتے۔ اور ہر شخص کے سامنے اپنی سیاہ کاری اور معصیت پر بیشمار دلائل و تاویلات پیش کرتے جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنی ساری کوششیں اس بات میں صرف کر دیتے ہیں۔ کہ ایک جابیہ مذہب اور آسمانی معاشرت کی بنیاد ہی کھل جائے۔ جونہی کوئی چیز اپنی رائے کے خلاف پاتے ہیں۔ تو آیات و احادیث سے اپنے مطلب کی تاویلات گھڑ لیتے ہیں۔ ان کی یہی عادت انہیں بیابانِ زندقہ والحاد میں لے جاتی ہے۔ وہ اپنی ساری عمر اسی سرگردانی میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اور آخر کار اپنا مقام جہنم بنا لیتے ہیں۔

یقین و ایمان کا چراغ گل ہونے کی وجہ اور دنیا میں الحاد و ضلالت کی تاریکیاں پھیلنے کا سبب یہ ہے۔ کہ آفتاب نبوت غروب ہو گیا۔ زمانہ نزولِ قرآن اور انوارِ وحی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس وقت تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین مقام کشف و شہود میں مشاہدہ جمال، باکمال مصطفوی سے مطمئن تھے۔ انہیں ذرہ بھر تردد و فکر دامنگیر نہ تھا مسلمان تو مسلمان اس زمانے کے کافر بھی شک و شبہ کے خطرات سے بے نیاز تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے۔ کہ وہ محض حسد و عناد اور شقاوت ازلی کی بنا پر اظہار بدگمانی پر اتر آتے تھے۔ ورنہ حضورؐ کے جمال باکمال نے تمام شبہات و شکوک کو کائنات کے ذہنوں سے صاف کر دیا تھا۔ ابو جہل جیسا سردارِ اشقیا راندۂ درگاہِ کبریا بھی جس وقت قرآن پاک سنتا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا اور کہتا تھا کہ میں بلا شبہ جانتا ہوں کہ یہ کلام کسی بشر کا نہیں۔ اور نہ آدمی ایسا بنا سکتے

ہیں۔ اَنَّ لَہٗ لَحَلَاوَۃً وَّاَنَّ لَہٗ لَطَرَاوَۃً (اس میں شیرینی اور تازگی پائی جاتی ہے) مگر اب دنیا میں ایک دنیا دار کو کوئی کلام اثر انداز نہیں ہوتا کبھی کبھی اس عالم روحانیت کا رشتہ اس کے دل کو کھینچتا ہے۔ مگر شیطانی نفس اس پر غالب آچکا ہے۔ اور نفسانی خواہشات کا غلام بن چکا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پاک کی حضوری و دوری کا فرق اس وقت معلوم ہوا جب وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کے یوم وصال پر فرمایا کہ "آج سے ہماری حالت بدل گئی۔ ہمارے دلوں پر ایک حجاب آگیا ہے۔ سر رشتہ معرفت ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔ اور نور یقین بجھتا جارہا ہے۔ ؎

رہ ندیدم چو برفت از نظرم صورت دوست
ہمچو چشمے کہ چراغش زمقابل برود

اس سے لطیف و نازک واقعہ حنظلہؓ جنہیں حنظلہ الغسیل کہا جاتا تھا) کا ہے۔ آپ کاتبان وحی میں سے تھے۔ ایک دن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آکر شکایت حالات کرنے لگے۔ آپ نے فرمایا "نافق حنظلۃ" (حنظلہ تم منافق ہو گئے) میں تو حنظلہ کو اپنے مخلصین میں شمار کرتا تھا۔ مگر وہ دل سے منافق نکلے۔ اور ان کا ظاہر و باطن ایک نہیں رہا اور انکے دل و زبان مختلف راہوں پر چلنے لگے۔ حاشا للہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اور تمہارا اصل مطلب کیا ہے۔ حنظلہ نے بتایا۔ کہ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتا ہوں۔ اور آپؐ کا جمال باکمال دیکھتا ہوں۔ آپ سے باتیں کرتا ہوں۔ تو نور یقین اس طرح

جلوہ گر ہوتا ہے۔ گویا حقیقت کو چشم ظاہر سے دیکھتا ہوں۔ اور دوزخ و بہشت میری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں لیکن جونہی آپ کی مجلس سے اُٹھ کر اپنے اہل و عیال میں آتا ہوں۔ اور اپنے مال و منال پر نظر کرتا ہوں تو میری حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ جو باتیں یاد ہوتی ہیں بھول جاتا ہوں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چونکہ صدیقوں کے راہ نما ہیں فرمانے لگے۔ "بھائی! تم سچ کہتے ہو۔ میرا حال بھی یہی ہے"۔ چنانچہ آپ حنظلہؓ کو لے کر مجلس حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچے۔ اور اپنی کیفیت کو بلاکم و کاست بیان کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ اس قسم کے خیالات دِل میں نہ آنے دو۔ حضوری و دوری میں ایسی حالت ہُوا کرتی ہے۔ اگر ہمیشہ ایک ہی حالت رہتی تو تم حقیقت کو آشکارا پاتے اور فرشتوں سے مصافحہ کرتے۔ ؎

اگر درویش بر یک حال ماندے | سر دست از دو عالم بر فشاندے
دمے بر طارم اعلیٰ نشینم | گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی کیفیت حال نورِ نبوت سے غیبت و حضور میں یکساں نہ تھی۔ حالانکہ یہ لوگ مقربانِ بارگاہِ رسالت اور سرحلقہ عارفانِ حق آگاہ تھے۔ بعد میں آنے والے حضرات کا معاملہ اسی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ یہ بڑا نازک اور باریک نکتہ ہے۔ ہمیں یہ خیال ہرگز نہیں کرنا چاہیئے کہ ان لوگوں کے ایمان بالیقین میں کسی قسم کا فتور یا نقص تھا۔ یہی وہ مقام ہے۔ جسے اہلِ تصوف تفاوتِ کثافت و لطافت

کا حجاب کہتے ہیں۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کیلئے یہ مثال زیرِ نظر رکھیں کہ دیوار بھی حجاب ہے اور شیشہ بھی حجاب ہے۔ مگر دونوں حجابات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جو شخص اپنے محبوب کے ساتھ ہم مجلس ہو۔ اس کے نزدیک روزِ روشن اور شب تاریک قلبی یقین کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں۔ فرق و تفاوت تو محض کیفیت یقین ہی میں ہے۔ جب صبح صادق ہوئی۔ دن روشن ہوا۔ آفتاب درخشاں ہوا۔ تو شب تاریک کی حالت بدل جاتی ہے۔ یہ کیفیت اور ہے اور مشاہدہ اور ہے۔ مگر اصل یقین وہی ہے۔ جو رات اور دن کی تاریکی اور روشنی میں تھا۔

حضرت علی المرتضیٰ امام الاصفیاء شہنشاہِ اولیاء کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے۔ لَوْ کُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ یَقِیْنًا (اگر حجاب اٹھ جائیں تب بھی میرا یقین زیادہ نہ ہوگا) اس کا مطلب یہ ہوا کہ حجاب ہو یا نہ ہو۔ میرا یقین یکساں ہے۔ اگر پردہ درمیان حائل بھی ہو۔ تو میں یوں دیکھتا ہوں۔ جیسے پردہ نہیں ہے۔ اگر یہ حجاب نہ ہو تو حقیقت بے حجاب ہو کر ظاہر آجائے گی۔ پھر نہ علم ہوگا۔ نہ کشف۔ نہ خبر ہوگی اور نہ اثر۔ ؎

ہست از پس پردہ گفتگوئے من و تو
چوں پردہ افتد نہ تو مانی نہ من

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

وصالِ دوم

اختلافاتِ اُمت اور فلسفۂ یونان

صحابۂ کرام۔ تابعین اور تبع تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جو (خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ کے بشارت یافتہ ہیں) کے زمانہ کے بعد امتِ محمدیہ میں اختلافات رُونما ہونے لگے۔ شر و فساد کے جذبات اُبھرنے لگے۔ اور ہر مسئلہ میں جرح و کدح کا دروازہ کھلنے لگا۔ انوارِ سنّتِ مصطفوی سے محرومی ہونے لگی۔ بدعات و ظلمات اسلامی دنیا پر چھانے لگیں۔ اسلامی ممالک کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک اتحادِ فکر کی ہوا اکھڑنے لگی دوسرے مذاہب اور یونانی فلسفے دلوں میں اثر انداز ہونے لگے۔ تاویلات و تشکیک کے دروازے کھل گئے اور عملی زندگی میں نصوصِ قرآنی۔ طریق صحابہ سلف صالحین کے مذہب سے انحراف ہونے لگا۔ مگر بایں ہمہ صورتِ حال قابلِ قبول تھی مگر اسلامی زندگی میں سب سے بدترین افتاد اور سنگین ترین سانحہ اس وقت رُونما ہوا۔ جب خلفائے عباسیہ خاص کر خلیفہ ہارون الرشید کے دورِ حکومت میں یونانی فلسفہ کی تعلیمات عربی میں تراجم ہو کر اسلامی فکر پر اثر انداز ہوئیں۔ یہ کام ابو نصر فارابی ملقب بہ معلم ثانی کی کوششوں سے بڑی تیزی سے ہوتا رہا۔ اسلامی فکر کے مخالفین کی دستاویزات اور

دشمنانِ دین کی سازشوں کے سارے ہتھیار اسلامی دنیا میں پہنچنے لگے۔ بعض لوگوں نے اسے علمِ جدید سمجھ کر حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور اسی خیال سے اس کی حمائت کی۔ مگر اکثر لوگ ایسے بھی تھے۔ جو اقتدار و قوت کے ہمنوا ہو کر اسکی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس فلسفہ کو فروغ دینے میں کوشاں تھے۔ مگر ایک بدترین طبقہ ایسا بھی تھا، جو شرارت پسندی سے اسلامی عقائد میں رخنہ پیدا کرنے کے لئے کام کرتا رہا۔

اندریں حالات علمائے حقانی نے کتاب و سنت کی حفاظت اور دنیائے اسلام کی وحدت فکری کو برقرار رکھنے کے لئے پامردی سے مقابلہ کیا، بعض نیک دل علمائے کرام نے فلاسفہ یونان کا مقابلہ کرنے اور انکی شرانگیز تاویلات کا مقابلہ کرنے کیلئے فلسفہ (یعنی علم کلام) کا مطالعہ کیا۔ اس کے بغیر چارہ کار ہی نہ تھا۔ غرضیکہ علومِ فلسفہ کی وسیع اشاعت سے دائرہ کلام و جدال اور میدانِ قیل و قال وسیع ہوتے گئے۔ بازارِ سخن گرم ہوا۔ تو علم کلام میں رونق آگئی۔ چنانچہ ہمارے اکثر متقدمین فقہا اور مشائخ نے ان علوم میں کتابیں لکھیں اور غیر اسلامی اندازِ فکر کی پُرزور تردید کی۔

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے اپنی تصانیف کے زور سے ان شرارت پسند فلاسفہ کے خیالات کی قلعی کھول کر رکھدی جو عوام میں تشکیک کی فضا پیدا کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مباحث و مناظرہ میں حکمائے یونان اور مخالفین دینِ اسلام کو دندان شکن جواب دیئے۔ ان حضرات نے جس نیک نیتی سے خدمت دین کا کام

کیا۔ وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ بایں ہمہ اس ضمن میں بعض ارباب کشف سے جو عالم رویا میں حضرت سرور کائنات علیہ التحیۃ والصلوات سے مشرف تھے۔ ان اسلامی فلسفہ دانوں کے متعلق آنحضرت سے گفتگو کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام فخرالدین رازیؒ کے متعلق فرمایا۔ ذَالِكَ رَجُلٌ مُعَاتِبٌ (یہ شخص معتوب ہے) بوعلی سینا کے متعلق دریافت کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا ذَالِكَ رَجُلٌ اضلہ اللہُ عَلیٰ عِلْمٍ (اس شخص کو علم کے باوجود اللہ نے گمراہی میں رکھا) جناب شہاب الدین مقتول کے متعلق پوچھا گیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ ھُوَ مُتبعہٗ وہ بوعلی سینا کا پیرو کار تھا۔ امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو ابتدائی زندگی میں متکلمین وقت سے مانے جاتے تھے۔ مگر آخری زندگی میں ان خیالات کو ترک کر کے طریقۂ تصوف اختیار کر لیا۔ زندگی کا ایک حصہ فقر و فاقہ میں گذار کر علمائے محققین میں مشہور ہوئے۔ آپ کے متعلق دریافت کرنے پر ارشاد ہوا۔ ذَالِكَ رَجُلٌ وَصَلَ اِلیٰ مَقْصُوْدِہٖ۔ یہ وہ شخص ہے جو آخر کار اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔

مختصر یہ کہ ارباب علم کلام کی کوششوں سے اگرچہ اہل فقہ کے رد و ابطال میں بڑا فائدہ ہوا۔ اور اہل اسلام کی بڑی خدمت تھی۔ تاہم ایک بات تجربہ میں آئی۔ کہ جو لوگ فلسفی اندازِ فکر اختیار کر لیتے ہیں وہ اکثر متذبذب عقیدہ و فکر پائے گئے ہیں۔ انہیں اسلام کی سیدھی سادھی تعلیمات پر شک و تزلزل کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ ایسا واقعہ بہت ہی کم دیکھا گیا ہے کہ علم الکلام پر غور و خوض کرنے کے بعد کوئی ورطۂ حیرت سے سلامت لوٹا ہو اور سرمایہ

ایمان ویقین کو بدستور رہا ہونا نہیں لایا ہو۔ اِلَّا مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ وَذَالِکَ قَلِیْلٌ

وصالِ سوم

فلسفیات و مباحث کے اثرات

سالک کے لئے سلامتی کا راستہ اور طالب کے لئے استقامت کی شاہراہ یہی ہے کہ وہ فلسفی اندازِ فکر کو اپنے لئے حرام سمجھ لے۔ اور علمِ کلام کے بے پناہ دلائل سے پرہیز کرے۔ قیل و قال سے ہٹ کر بحث و مناظرہ سے اجتناب کرے۔ عقائدِ اہلِ سنت وجماعت میں اتنا کافی ہے۔ کہ اجمالی دلائل پر اکتفا کرے۔ اور اس کی اتباع پر زیادہ زور دے۔ اور کتاب و سنت کے احکام اور شریعت کے معاملات کو عقل کا تابع بنانے کی بجائے ایمان کی روشنی میں عمل کرے۔ اور منقولات کو معقولات پر مقدم خیال کرے اور تاویل و تشکیک سے بچنے کی کوشش کرے۔ اور اعتقادی قدروں کو سامنے رکھے۔ اور اپنے فہم قاصر اور عقلِ ناقص پر اعتماد نہ کرے۔ کیونکہ جو شخص وادیٔ تذبذب میں راستہ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی عقل جواب دے جاتی ہے۔ اور اس کی دانش ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس سے سلامت نہیں نکل سکتا۔ اگر عقل اسرارِ غیبی کی معرفت اور اصلاحِ احوال کے لئے مفید ہوتی۔ تو بعثتِ انبیاء میں ہدایتِ خلق کا کوئی پہلو نہ ہوتا۔ ان انبیاء کرام نے عقل کا غلام بنانے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام امر و نواہی کا فہم پیدا کر دیا۔ اور تحمل و تکالیفِ شرعیہ کا خوگر بنا دیا۔

عقل کی پرواز کہاں تک ہے۔ احوالِ آخرت، کیفیت عمل اور عملی قوت کا اندازہ۔ صورت اعمال۔ تعینِ اوقات۔ جزائے اعمال کی خصوصیات۔ وحی آسمانی کے بغیر تسلیم نہیں کی جاسکتیں۔ ان مقامات کو سمجھنے کیلئے تو کشف و وجدان بھی بے بس اور حیران رہ جاتے ہیں۔ چہ جائیکہ عقل و دانش کی رسائی ہو۔ اسی طرح حواس عشرہ ظاہری و باطنی عقل کے ادراک سے باہر ہیں۔ اور مضمراتِ کشف کی دریافت سے عقل عاجز ہے اور وحی کے دقائق کے سمجھنے میں عقل و خرد قاصر ہیں۔ یہ تمام چیزیں قوتِ ایمان سے ہی معلوم کی جاسکتی ہیں۔

محسوسات موجودات کی ظاہر تریں صورت ہے۔ اور اجسام روشن تریں محسوسات میں شمار کئے گئے ہیں۔ دنیا کے متکلمین و حکمائے عقل جسم کی حقیقت و ماہیت کو دریافت کرنے میں ابھی تک حیران و سرگردان ہیں اور آج تک یہ لوگ جسم کی حقیقت اور ترکیب کی معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اور ان کے تجربات ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں۔

انسان کے نزدیک تریں چیز اس کی اپنی ہستی ہے اور اس کے نفس ناطقہ سے یہ اشارہ کرتا ہے۔ کہ میں نے کیا۔ میں نے کہا۔ میں نے دیکھا اور میں نے سُنا آج تک عقل انسانی یہ حقیقت معلوم نہیں کر سکی۔ کہ یہ کون ہے ؟ اور کیا ہے؟ جو یہ کہتا ہے۔ کہ میں نے کیا۔ میں نے کہا۔ میں نے دیکھا۔ اور میں نے سنا۔ کسی کہنے والے نے کیا خوب کہا۔ ؎

آنکہ خود را شناخت نتواند　　　آفرینندہ را کجا داند

تو کہ در ذاتِ خود زبوں باشی
عارفِ کردگار چوں باشی

ہاں جو عقل اجمالی طور پر بھی ظہورِ حق اور وجود آثارِ صنعِ باری تعالیٰ کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائے۔ یا اس کے تقدس وصفات کا اندازہ لگالے تو یہ بڑی بات ہے۔ مگر اس کے آثار وصفات کی تفصیلات وتشریحات کا محاسبہ کرنا ممکن نہیں پھر یہ آثار وصفات اس جہان یا دوسرے جہان میں بے حد و بے قیاس ہیں۔ اسے عقلی انداز سے جاننا ناممکن ہے۔ سوائے اخبار انبیاء صلوات اللہ علیہ والسلام کے انہیں کوئی قوت نہ جان سکتی ہے اور نہ سمجھ سکتی ہے۔ شانِ نبوت کے سامنے عقل کی آنکھیں بے نور رہتی ہیں۔ ہاں عقل کو اپنے گوشِ ہوش سے فرمانِ نبوت سنتے رہنا چاہیئے۔ آنکھ کی بصارت احکام پر عمل کرنے میں لغزش کھا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے کان کو آنکھ پر فوقیت وفضیلت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ ؕ

تا گہر وصفِ تراشد صدف
سامعہ بر باصرہ دارد شرف

عقل مشعل راہ ہے۔ اس کی روشنی میں راستے میں کنوئیں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ مشعل راہنمائی کرتی ہے اور راستے کے سارے نشانات اس مشعل سے روشن ہو جاتے ہیں۔ مگر خود نہ وہ راستہ بناتی ہے نہ ہی منزلیں قائم کرتی ہے چنانچہ راہ وہ ہے جس پر نشانات پہلے سے ہی لگے ہوئے ہوں۔ ان نشانات وآثار کے علاوہ اگر چلا جائے تو مشعل کی روشنی بھی راہ نمائی سے قاصر رہے گی۔ اگر نقل کو اصل کے مطابق بنا کر عقل کے تابع کر لیا جائے تو پھر بھی عقل ہیں نہیں

آ سکتی۔ اور نہ ہی اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اندریں حالات اگر ہم اس مسئلہ پر غور کر لیں۔ کہ ایمان کہاں ہے؟ اور اسلام کیا ہے؟ تو یہ تکذیب و انکار کی دوسری شکل ہے۔ کیونکہ ایمان اور اسلام تو قبول و انقیاد کا دوسرا نام ہے۔ نہ کہ انکار و استرداد کا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اندریں حالات ذرّہ اور آفتاب۔ قطرہ اور دریا۔ جزو اور کل محکوم اور حاکم۔ بندہ اور خدا۔ ایک دوسرے کے مساوی اور برابر قرار پائینگے۔ ایسی صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ تو کیا اور کون ہے؟ جو میں نہیں ہوں۔

اس نکتہ کو ذہن نشین کرنے کے لئے یہ مثال سامنے رکھیں۔ ایک حصۂ زمین کا بادشاہ ایک حکم جاری کرے۔ یا کوئی پیغام بھیجے۔ مگر اس کی رعایا کا ایک فرد اُٹھ کر یہ کہے کہ چونکہ یہ حکم میری عقل میں نہیں آیا۔ یا یہ خبر میری سمجھ سے بالا ہے۔ لہٰذا میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا یہ اعلان انکار حکم و ترکِ تعظیم پر محمول کیا جائیگا۔ اندریں حالات ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے احکام کے ماننے کے لئے ظلمتِ شک و شبہ کو دور کرنا ہوگا۔ اور اس نورِ ہدایت اور جلوۂ عنایت کو بہ طیب خاطر قبول کرنا ہوگا ؎

ہرچہ نماید کہ ممکن آں مگو
وآنچہ بگوید کہ مکن آں مکن
بہرِ سخن او ہمہ تن گوش باش
وسوسہ بگذار د از شیطاں مگو

وصالِ چہارم

عقل، علم اور ذکر و فکر کے حدود

اگر یہ کہا جائے۔ یہ مسئلہ جو علمائے دین سے نقل کیا گیا ہے۔ حق کی مذمت کرتا ہے تو کیا عقل کی پھر بھی فضیلت نہیں مانی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ عَقَلُ (سب سے اولیں مخلوق خداوندی عقل ہی ہے)

اس حدیث پاک سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ عقل اولیں و افضل تریں چیز ہے کیونکہ تمام اعمال و امور کی بنیاد تو عقل ہی ہے۔ عتاب و خطاب عقل کے بعد نافذ نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ علمائے دین نے بہت سی آیات و احادیث کو عقلی احکام سے بالاتر قرار دیا ہے۔ حالانکہ اہلِ حق کا مذہب اسبابِ علم پر ہے۔ جس کی بنیاد عقل پر ہے۔ اندریں حالات تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ عقل ہی بہترین چیز ہے۔ ہاں وہ عقل جسے کارخانۂ خداوندی میں معزول و بیکار بنا دیا گیا ہے اور اس کی بصیرت چھین لی گئی ہے غلط نتائج نکال لینی ہے۔

علمائے کرام نے اس مسئلہ کی وضاحت یوں فرمائی ہے کہ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ العَقلُ سے مراد مخلوق اول اور موجود ثانی ہے۔ جسے عقل اول روح اعظم اور قلم اعلیٰ کی اصطلاحات سے بھی بیان کیا جاتا ہے۔ اور اہلِ کشف و وجدان اور اہل دین و ایمان اس عقل کو حقیقت محمدی اور روح قدس صلی اللہ

علیہ وسلّم معلوم کرنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ یہ عقل ہیں ازل میں مربی ارواح رہی اور عالم عنصریہ خلیقیہ کے ظہور میں آنے کے بعد آپ کے جسم مبارک میں منتقل ہوگئی اور اسی نے مدبر و متصرف ہو کر اہلِ جہان کی تکمیل کی۔ یہی عقل ہماری ذہنی اور روحانی راہ نمائی کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہی ہمارا مدعا و مقصود ہے چنانچہ ارواح وعقول جزئیہ جو انسانوں کے اجسام سے متعلق ہے۔ اسی عقل اول اور روحِ اعظم سے فیضیاب ہیں۔ اور یہ عقل کل ہی معدنِ فیض اور منبع انوار ہے۔ یہ عقل ان لمعاتِ نور کی شعاع ہے۔ جس طرح ہمارا نورِ بصیرت انوارِ آفتاب کا محتاج ہے اسی طرح یہ عقل بھی اس عقل کل کی ضیا باریوں کی محتاج ہے۔ جب تک آفتاب روشن نہ ہو ہماری بصارت کی روشنی کام نہیں کر پاتی۔ چنانچہ عقل نورِ نبوت کے تابع ہے۔ اس سے برابری نہیں کر سکتی۔ جس طرح ہماری آنکھوں کی روشنی آفتاب عالمتاب کی نورانی شعاعوں کے سامنے بے بس ہے۔ ویسے ہی ہماری عقلیں نور نبوت کے سامنے بے بس ہیں۔ اندریں حالات ہم عقل کی فضیلت اور برتری سے انکار نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ عقل مستحق ثواب و عذاب ہے۔ اور باعث صلاح و فساد ہے۔ اور یہی عقل دنیا میں معاش و جہاد کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشمار احادیث۔ آیات۔ اخبار اور آثار عقل کی فوقیت و عظمت پر روشنی ڈالتی ہے

جن لوگوں نے عقل کو علم سے برتر قرار دیا ہے۔ وہ تحقیق و تنقیح کے بعد شاید حق بجانب ہوں۔ کیونکہ حضرت حق تعالٰے کی معرفت اور عبودیت کے انجام کا کے صرف دو ہی طریقے ہیں۔ پہلا ذکر اور دوسرا فکر۔ بعض علما نے فکر کو ذکر پر ترجیح دی ہے۔ اور معرفت کا دستور فکر کو ہی قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ

تفکر الساعۃ سنین. خیر من عبادۃ سنین (ایک لمحہ فکر یہ دو سال عبادت سے بہتر ہے) ایک جگہ ستین سنۃ یعنی ساٹھ سال سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ یہ قیام درجات فکر میں بیان کیا گیا ہے۔ مولینا روم نے خوب فرمایا ؎

بعض بزرگان دین نے فرمایا۔ کہ ذکر عاشق کی طرح اور فکر عارف کی طرح ہونا چاہیئے۔

علمائے دین کا ایک ایسا طبقہ بھی ہے۔ جنہوں نے ذکر کو فکر پر فوقیت دی ہے۔ ان کے ہاں ذکر صفت الٰہی ہے۔ فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ (تم میری یاد کرو۔ میں تمہیں یاد کروں گا) اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (اللہ کا ذکر کثیر کرتے رہو) بہر حال فکر بندہ کی صفت ہے۔ جو متعلق بصفات ہے۔ اور ذکر کا تعلق ذات سے ہے۔ ذات سے تعلق فضیلت رکھتا ہے۔ تفکروا فی الآئیہ ولا تفکروا فی ذاتہ (اللہ کی نعمتوں کا فکر کرو اور اس کی ذات کا فکر نہ کرو۔ الغرض فکر کے بغیر راہیں کھل ہی نہیں سکتیں۔ کیونکہ فکر ہمیشہ عقل سے ہوتی ہے۔ اور عقل اپنے صانع کو پہنچاننے میں بڑا دخل رکھتی ہے مگر یہی عقل دین کے کاروبار اور حق الیقین کے مرتبہ میں مطلق دخل نہیں رکھتی اور وحی آسمانی کے سامنے عقل ہیچ ہو جاتی ہے۔ اور حکم شارع علیہ السلام کے سامنے بھی اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ عقل کے پاس علم و معرفت ضرور ہے۔ بشرطیکہ وہ علم شارع سے استفادہ کرے۔

فکر کے لئے علم و معرفت کس روش اور طریقہ پر ہونا چاہیئے؟ ابھی اہلِ تحقیق و تقلید کے مراتب اور تفاوت کی تشریح باقی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

علمائے دین نے آیات و احادیث کی تاویل و تصرف میں عقلی دلائل دیئے ہیں۔ اور انہوں نے معقولات کو منقولات کے ساتھ مطابقت دی ہے جن عقلی اسباب کو شرع شریف کے موافق تشریح کی ہے اسے معقولات کہا جاتا ہے۔ مگر وہ چیزیں جو شرع کے احکام کے خلاف فہم ناقص میں سمائی ہیں۔ قابل اعتماد و لائق اعتبار نہیں۔ یہ طریقہ ان لوگوں نے اختیار کیا۔ جو فلسفہ کی چکنی چپڑی باتوں سے دین کی تشریح کرتے ہیں۔ یہ لوگ سچے مسلمان نہیں اور ان کے دِل خالص دین سے وابستہ نہیں۔

مندرجہ بالا تقریر سے ہمارا مطلب یہ ہے۔ مذہب اہل حق یہ ہے کہ عقل کو علم کے اسباب سے تسلیم کیا جائے۔ اور ایسا مان لینے سے ہمارے دعوٰے کی نفی بھی نہیں ہوتی۔ اور عقل کی اہمیت بھی تسلیم کر لی جاتی ہے۔

وصال پنجم

عقل کی صحت کیا ہے؟

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے۔ کہ عقل اسلئے ضروری ہے۔ تاکہ سچا نبی پہچانا جا سکے اور فکر اس لئے ضروری ہے کہ نبی کے معجزات ذہن نشین

کئے جا سکیں۔ کیونکہ ان چیزوں کو عقل و فکر کے بغیر دریافت کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی ماہیت و کیفیت کو پہچانا جا سکتا ہے۔

اس کے جواب میں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ محض عقل تو کوئی چیز نہیں۔ بلکہ ہدایت اور توفیق ایزدی منزل مقصود تک پہنچاتی ہے! ور انہی چیزوں سے گوہر مقصود حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو کفار قریش دانا بھی تھے اور عاقل بھی۔ ان لوگوں نے اپنے کاروبار میں بڑی بڑی ترقیاں کیں کلام میں بڑی بڑی نازک خیالیاں دکھائیں مگر معجزات کے مشاہدہ کے باوجود منزل مقصود پر پہنچنے سے قاصر رہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق میں ناکام رہے جن لوگوں نے نبی علیہ السلام کی سچائی کو دریافت کر بھی لیا۔ وہ حسد و عناد کی وجہ سے اپنے کذب و کفر پر قائم رہے۔ انہوں نے اخلاص و راستی کا راستہ اختیار نہ کیا۔ اگر عقل راہنما تھی تو انہیں کبر و حسد اور بغض و عناد کی خباثت سے نجات نہ دلا سکی۔ اپنے عیب کو ہنر سمجھتے رہے اور عقل و فرزانگی کے باوجود ان کی کوئی تدبیر انہیں راہِ راست پر نہ لا سکی۔ وہ کوئی ایسا ضابطہ و قانون پیش نہ کر سکے۔ جو انہیں راہِ راست پر لا سکتا۔ وہ اپنے دین و ملت کے کارناموں سے بھی کوئی راہ نمائی حاصل نہ کر سکے۔ انہیں مذہب کی قدامت اور استقامت بھی راہِ راست پر نہ لا سکی۔ دنیا میں بے شمار عاقل و دانا اور حکماء و امراء گذرے ہیں بلکہ اس روئے زمین پر بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ گذرے ہیں۔ اور اپنے دبدبہ حکمت۔ سلطنت کی وجہ سے قاف تا قاف مشہور تھے۔ مگر ان کی عقلمندیاں بھی ان کی راہنمائی میں ناکام رہیں۔ وہ اپنے بارے کچھ نہ سوچ سکے اور عقل و

دانائی کے باوجود دین وملت اسلامیہ کے مخالف ہی رہے بعض تو اپنے غرورِ نفس اور ہوا وہوس کے بڑے بڑے قواعد وضوابط بناتے گئے مگر ان کی موت کے بعد ان کے بنائے ہوئے قوانین وضوابط ایک ایک کر کے مٹتے گئے۔ ان تمام حالات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نبوت بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ اور حکمت ایک علیحدہ چیز ہے۔ اور سلطنت وحکومت بالکل جدا چیز ہے۔ اس موضوع پہ ہم اثبات نبوت میں مفصل گفتگو کریں گے۔

اثبات نبوت وہ ہے۔ جو نبوت کو ثابت کرے۔ بلکہ ہمیں یوں کہنا چاہیئے کہ نبوت خود سب کو ثابت کرتی ہے۔ یہ بات معلومات عامہ میں شامل ہے۔ کہ اثبات واجب ہے۔ یعنی وہ ایسی چیز ہے۔ جس کی ہستی ضروری ہے اور وہ کمالات کی تمام صفات کو جمع کرتی ہے۔ ہمارا مطلب یہی ہے بغیر ہمارا عقل بات کرنے کا نام جنون ہے۔ اور ہمیں ڈر ہے کہ اس موضوع پر طویل گفتگو کرنے سے اصل موضوع کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ اور ہم اصل موضوع سے دور نہ ہٹ جائیں۔

اصل مطلب یہ ہے۔ کہ عقل ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ اور عقل کی نعمت کا شکر یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ اسے بلا تردد وفکر کے تصدیق رسالت اور اطاعت حکم رسول اختیار کرنا چاہیئے اور اس کے برعکس نہ جائیں۔ اور دائرہ ایمان سے باہر نہ نکلیں۔ وہ کتنا بد قسمت

۱؎۔ ان الفاظ میں "دین الٰہی" جو اکبر کے عقلمند اور دانشور حاشیہ نشینوں کی عقلی پیداوار تھی۔ اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے اسکے مآل ونتائج سے آگاہ کیا ہے۔ حضرت محدث رح کا اسلوب بیان آپ کی ساری تحریروں میں پایا جاتا ہے۔

انسان ہے۔ جس کے سامنے نعمتوں کا دستر خوان بچھا ہو۔ اور وہ اس پر شک و شبہ کرتا رہے۔ اور کھانے کی بجائے تجسس کرتا رہے اور کہتا جائے۔ یہ کیا چیز ہے یہ کھانا کیسا ہے؟ اسے کون لایا تھا؟ یہ کہاں سے آیا ہے؟ کیا اس کھانے سے میں آسودہ خاطر ہو جاؤنگا؟ اور انہیں خیالات میں وقت ضائع کرتا رہے۔ حتیٰ کہ دوسرے لوگ آکر اس کھانے سے لطف اندوز ہوں اور پیٹ بھر کر چلتے بنیں۔ مگر وہ محروم و مایوس اُٹھے اور دل میں بجز حسرت و یاس کے اور کچھ نہ رکھے۔ یا آفتاب عالمتاب طلوع ہو۔ اپنے نور سے کائنات کو روشن کر دے۔ اور ایک شخص اپنی آنکھیں بند کر کے کہے کہ واقعی آفتاب طلوع ہو گیا ہے۔ یا لوگ یونہی غلط مشہور کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ اس نور کی حقیقت سے بے خبر رہے۔ اور کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ اور وہم و گمان کے دریائے ظلمات میں بھٹکتا رہے۔ اور حسرت و یاس کے کنوئیں میں گرا رہے۔ ایسی عقل سے دیوانگی اچھی اور ایسی دانش سے بیگانگی ہزار درجہ بہتر ہے۔

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی ۔۔۔ دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

وصال ششم

ظاہری عقل کے معائب

اگر عقل حقائق اشیاء کی دریافت اور احوال موجودات کی معرفت میں کامل ہوتی تو دنیا بھر کے تمام عقلاء کائنات کی اشیاء کی خاصیت کی شناخت سے محروم

نہ رہے۔ آج تک، ان عقلاء اور سائنس دانوں کو یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ کاہ ربا کے اندر کونسی (مقناطیسی) قوت کام کر رہی ہے؟ وہ اس قوت کو صورت نوعیہ کے نام سے تعبیر کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں۔ صورت نوعیہ اسے کہتے ہیں۔ کہ تعیش و تشخیص کو جسم کی نوع مختلف ہو جائے۔ اگر یہ بات پہلے کی تلافی کرتی ہو۔ اندریں حالات ہمیں یہ اعتراف کرنا ہو گا۔ کہ اللہ برتر و بزرگ نے اسے ایسا ہی پیدا کیا ہے۔ اور یہ اثر اس میں اس نے دیا ہے۔ اس کے بغیر ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ آج تک اس حقیقت کو معلوم کرنے کیلئے کسی سائنس دان یا حکیم نے نئی توجیہہ پیش نہیں کی۔ جھوٹی اور لایعنی توجیہات سے تو عقل کی نامعقولیت واضح ہوتی ہے۔ اور اسے اپنی ناداناتی کا مزید اعتراف ہوتا ہے۔ سلمان (ساوجی) جس کے نام سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت سلمان رضؓ فارسی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں۔

سلمان فارسیؓ کے حالات

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک یہودی کے غلام تھے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے یہودی سے خرید کر آزاد کر دیا۔ آپ فارس کے رہنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی عمر ۲۵۰ سال سے بھی زیادہ تھی۔ آپ نے اس طویل عمر میں ساری دنیا کی سیر و سیاحت کی اور مختلف ادیان و مذاہب کا مطالعہ کیا۔ عمر کا ایک حصہ یہود و نصاریٰ کی قید میں گذارا۔ کتنے ہاتھوں فروخت ہو کر آزاد ہوئے۔ اور آخر کار نگاہِ فیض اثر جناب خیر البشر علیہ السّلام نے ہمیشہ کیلئے

آزاد کر دیا۔ اور تمنائے دلی بر آئی۔

سبحان اللہ یہ کیسے لوگ تھے۔ کہ صرف خبر سن کر حضورؐ پر شیفتہ و فریفتہ ہوئے۔ اور قدم بوسی کو آئے۔ اور آپ کا جمال باکمال دیکھتے ہی دولتِ اسلام سے مالا مال ہوئے۔ مگر ان لوگوں پر کس قدر افسوس ہے جو ہزاروں احادیث اور اخبار سننے کے باوجود توجہ نہیں دیتے۔ سلمانؓ فارسی نے غلام ہونے کے باوجود اہل فارس پر داغ حیرت و حسرت لگا دیا۔ اور اس کے خلوص و محبت نے اس طرح اسلام کی چاشنی حاصل کی۔ کہ نوشیرواں اور خسرو جیسے محروم رہے۔

صہیبؓ رومی قیصر روم کے لئے باعثِ رشک ہے۔ بلال حبشیؓ کے متعلق آپ نے سنا ہوگا۔ کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نسبت اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔

منھم مقتصد و منھم بالخیرات (بعض ان میں سے میانہ رو ہیں۔ اور بعض ان میں سے سبقت لے جانے والے ہیں۔ اور یہ سبقت محض نیکیوں میں ہوتی ہے) پھر آپ نے فرمایا یہ چار شخص ہیں۔ جن میں سے ایک تو میں خود ہوں۔ جو تمام عربوں سے پہلے نیکی کے میدان میں اُترا۔ دوسرے سلمان فارسیؓ ہیں۔ جو تمام فارس والوں سے سبقت لے گئے۔ تیسرے صہیبؓ رومی ہیں اور چوتھے بلال حبشیؓ ہیں۔ ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا۔ کہ یا رسول اللہ صلعم یہ کس قدر شفقت اور کرم ہے۔ کہ آپ بذاتِ خود ان فقراء و غرباء میں اپنے آپ کو شمار کر کے ان کی عزت افزائی فرما رہے ہیں۔ یا رسول اللہ آپ تو سابق سابقوں ہیں جانِ جانانِ جہاں ہیں۔ آپ کو ان سے کیا نسبت اور انہیں

آپ سے کیا شرکت۔ جناب باری تعالیٰ نے آپ کو مامور و مبعوث فرمایا ہے۔ آپ فقراء و مساکین کے ساتھ رہتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے ہیں واصبر نفسك مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ (آپ ان کے ساتھ رہیں۔ تاکہ وہ اپنے پروردگار کو یاد کرتے رہیں۔)

ہلا! خوش باش کاں محبوبِ جانرا بدرویشاں و مسکیناں سرے ہست

اللہ تعالےٰ جانتا ہے کہ آپ نے ان درویشوں اور مسکینوں کی کتنی عزت افزائی کی ہے۔ اور تمام مراعات اپنے ذمہ لی ہیں۔ ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان درویش صحابہ میں سے کسی ایک کے ساتھ تھوڑا سا جھگڑا کیا۔ اور سخت کلامی سے کام لیا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شکایت کی۔ اپنی حالتِ زار بیان کی تو حضورؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا۔ ادرِك! ادرِك! یا ابابکر۔ جلدی جاؤ۔ اور اس کو راضی کرو۔ اور معذرت چاہو۔ اگر تم نے کسی کو رنجیدہ کیا۔ تو یوں سمجھو گویا تم نے خدائے عظیم کو تکلیف دی ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ سے لوگ پوچھتے۔ کہ آپ کا نسب کیا ہے تو آپ فرماتے۔ اسلام۔ اگر دریافت کیا جاتا کہ تمہارا باپ کون ہے۔ آپ فرماتے اسلام اور فرمایا کرتے تھے کہ جب ہمارا دین اسلام ہے۔ تو ہمارا سب کچھ اسلام ہی ہے۔ ہمارا دین ہمیں ماں، باپ، بہن بھائی سے بھی عزیز تر ہے۔ اکثر صحابہ کرام نے دین کی خاطر باپ بھائی، خویش و اقارب اور یار و عزیز کو چھوڑ دیا بلکہ میدانِ جنگ میں انہیں قتل کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ اور یوں اپنی والہیت

اور عشق کا ثبوت دیا۔

حقیقت میں جبتک ہماری اعتقادی قوت اس طرح نہ ہو جائے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے متعلق فرمایا گیا تھا۔

لَوْ کَانَ الْعِلْمُ وَالدِّیْنُ مُعَلَّقًا بِالثُّرَیَّا لَنَالَهٗ رَجُلٌ اَوْ رِجَالٌ مِنْ فَارِس — اگر علم اور دین اوج ثریا پر بھی معلق ہوتا۔ تو ہمارے فارس کے لوگ اسے یہاں سے بھی حاصل کر لیتے۔

اس حدیث میں جس آدمی کی طرف اشارہ ہے وہ حضرت سلمان فارسیؓ ہی ہیں۔ یا ایسے ہیں اور صدق و صفا کے مالک لوگ ہیں۔ اگر تم صحیح معنوں میں اللہ کے بندے ہو تو آگے بڑھو۔ اور مضبوط عقیدہ کے ساتھ ایمان لاؤ۔ تاکہ تمہیں تمام چیزیں معلوم ہو جائیں۔

مَنْ عَمِلَ عَالِمًا اَوْرَثَهُ اللّٰهُ مَا لَمْ یَعْلَمْ — جس شخص نے ایک ایسی چیز پر عمل کیا جس کے متعلق وہ جانتا ہے تو اللہ تعالٰی نے ان چیزوں کا بھی علم عطا کر دے گا۔ جنہیں وہ نہیں جانتا۔

اس کلیہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ تو ایسا علم تعلیم و تفہیم کے بغیر آتا ہے۔ لیکن اگر تعلیم و تفہیم کے بعد کسی چیز کا علم ہو تو اسے "معقول" کہا جائے گا۔ اور معقول ہی مشکل اور محال ہے۔ کہ جس کی تعلیم اس نے دی ہی نہیں اور اس کی واقفیت کسی کو ہم نہیں پہنچائی گئی۔ ظاہر ہے۔ کہ لوگ اس کے جاننے سے محروم رہیں گے اور بے نصیب بیٹھے رہیں گے۔ لیکن اگر ہم اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیں۔ تو نہ محرومی کا شکار ہوتے اور نہ ہی بے نصیبی ہمیں چھو

سکتی ۔ کیونکہ اس نے تعلیم بھی دینی ہے۔ اور بخشش و عنائت بھی نازل فرمانی ہے لیکن یہ ساری نوازش مقرر قابلیت و استعداد عنایت کی جاتی ہیں۔ اور قدرت کی عنائت مزاج و طبیعت کے مطابق آتی ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس کی مہربانی سے ہٹ کر محض استعداد و قابلیت سے ہی سب کچھ سیکھ لیں گے۔ تو یہ عقیدہ ہمیں فلسفہ کی ظلمت آباد راہوں کو لے جائیگا۔

ہاں ہاں ہم نے آگے بڑھنا ہے۔ اور ہمیشہ سایۂ نبوّت میں رہنا ہے اور آبِ حیات رحمت سے سیراب ہونا ہے۔ اندریں حالات ہمیں چاہیئے۔ کہ زبان حال اور قال سے نہایت عجز و انکساری سے انوار الٰہی کی التماس کی جائے۔ یوں نورِ معرفت دل پر پڑتا ہے۔ اور سینہ انوارِ خداوندی سے روشن ہوتا جاتا ہے۔ ان انوار میں ہی غیبی صورت اور ایمانی شکل نمایاں نظر آنے گی۔

فَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ

جس شخص کا اللہ تعالےٰ نے اپنے دین اسلام کیلئے سینہ کھول دیا ہے۔ وہ اپنے پروردگار کی روشنی میں معمور ہو گیا۔

جو شخص آفتاب پرانوار کی روشنی میں ہو گا۔ اسے آفتاب جسے چاہے آگ کی طرح گرم کر دے گا۔ اور جسے چاہے ماسوا اللہ سب کو جلا کر خاکستر کر دے گا۔ آفتاب کے اس کمال کے سامنے معلوم ہو جائے گا۔ کہ روشنی کے متعلق حجت و تاویل اس کی کیا حیثیت ہوگی۔ ؎

آفتاب نہ دجہاں آنگہ کسے جوید سہا
مصطفےٰ اندر میاں آنگہ کسے گوید ز عقل

وصالِ ہفتم

کیا خدائے تعالیٰ کو چشمِ بصیرت یا چشمِ ظاہر سے دیکھا جاسکتا ہے؟

ہم اوپر بحث کر رہے تھے، کہ عقل کوئی مستند چیز نہیں ہے۔ مگر سلسلہ سخن اتنا دراز ہوا کہ ہم کہاں سے کہاں نکل گئے اور نیا رنگ پیدا ہو گیا۔ ایک عجیب کیفیت اُبھر آئی۔ اور خورشید حقیقت کی ضیا پاشیاں پھیلتی گئیں۔ باطن کی توجہ شروع ہوئی۔ یہ وہی روشنی ہے جس نے روزنِ خیال سے پرتو ڈالا۔ اور سینہ سے کدورت کے تمام خس و خاشاک کو دُور کر دیا۔ یہ وہ نور ہے جسے دل کی آنکھ تو دیکھ سکتی ہے۔ مگر چشمِ سر دیکھنے سے قاصر ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتے ہیں کہ گویا چشمِ سر بھی اسے ملاحظہ کر رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے کے بعض محجوب و محروم لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو بچشمِ سر دیکھ لیا۔ اور دوسروں کو بھی دکھا سکتے ہیں۔ یہ خیال اس زمانے کے ذہنوں کی پیداوار ہے۔ پہلے بزرگوں نے اس قسم کے رسوا کُن خیالات کے اظہار کی جرأت نہیں کی۔ اور نہ ہی انہوں نے دوسروں کو ایسا کہتے سنا۔ البتہ اربابِ تحقیق و تمکین نے جو کچھ قرار دیا ہے۔ اس کا قاعدہ مقرر ہے بہرحال ان کی یہ بات دو حالتوں سے خالی نہیں ہوگی۔ اول یہ کہ وہ سُکر و حال کے غلبہ سے کہتے ہونگے۔ دوسرے یہ کہنا محض تصنع و بناوٹ کے طور پر ہوگا۔ صاحبِ "تصرف" نے اس مسئلہ کو یوں بیان کیا ہے۔ کہ مشائخ

طریقت نے خدائے تعالیٰ کو دنیا میں بچشم سر نہیں دیکھا۔ مگر چند مدعی جن کی بات قابلِ اعتماد نہیں اور نہ ہی وہ اتنے ثقہ ہیں کہتے ہیں کہ اس راہ کے سالک اور منزل کے طالب جب اس مقام پر پہنچتے ہیں۔ جہاں بصر و بصیرت کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر و باطن یکساں ہو جاتا ہے۔ اور انہیں صورت و معنیٰ یکساں دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ خدائے تعالیٰ کو بچشمِ بصیرت یا بچشم سر دیکھ رہے ہیں۔

ان کے اس دعویٰ کے بعد ہمیں یہ سوچنا ہو گا۔ کہ آیا ان لوگوں کا اشارہ اس حقیقتِ حال کی وضاحت کرتا ہے جیسے وہ جانتے ہیں یا جیسے وہ کہتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ کہ اس معاملہ کی اصل نادر اور غریب الوجود ہے۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ایسا طبقہ ہے جن کے خیالات وحدت الوجود[1] کے حامی ہیں۔ اور ان کے خیالات توحید کی طرف ہیں۔ دوسرا طبقہ صفائی قلب کے ساتھ اس بات کی وضاحت کرتا ہے۔ اور تھوڑی سی روشنی بہم پہنچاتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ان لوگوں میں تصنع اور بناوٹ پائی جاتی ہے۔ اور ان کے اقدام غلط ہیں۔ یہ ساری باتیں ظاہراً تو بڑی آسان دکھائی دیتی ہیں مگر ان کی عملی صورت بڑی مشکل ہے۔ لیکن غلبہ کیفیت یا مقتضائے سطوت کے وقت

---

[1] شیخ محی الدین مسئلہ وحدت الوجود کے حامی اور ترجمان تھے۔ آپ کے برعکس اس زمانہ کے پایۂ ناز عالم دین حضرت مجدد الف ثانیؒ مسئلہ وحدت الشہود کے پرزور مبلغ۔ ان دونوں حضرات کا اس مسئلہ پر کچھ عرصہ کے لئے اختلاف رہا۔ اور بعض رسائل اور مکتوبات اس بحث کی وضاحت میں ہماری نظر میں سے گذرے ہیں یہ مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود صوفیائے کرام کے ہاں بڑے مشہور موضوعات ہیں جن پر تصوف میں آج تک سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

پیش آئے۔ تو اس کا مقام دوسرا ہے۔ اور اس کی حالت بھی مختلف ہے۔ بایں ہمہ انصاف کی بات یہ ہے۔ کہ اس ضمن میں ہمارے سر حقیقت کے مکاشفین اور علم و حکمت کے ماہرین نے جو نتائج فکر پیش کئے ہیں وہ ہر طرح صحیح اور بجا ہیں۔ حضرت محبوب سبحانی سید عبد القادر جیلانی قدس سرہ العزیز سے روایت ہے۔ کہ آپ کے ایک مرید صادق نے یہ دعوٰی کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بچشم سر دیکھتا ہے۔ اور مشاہدہ کرتا ہے۔ جب یہ بات حضرت غوث الاعظم رضؓ تک پہنچی۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ اسے آئندہ ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیئے اور اس دعوٰی سے باز آنا چاہیئے۔ المختصر آپ کا اس دعوٰی سے منع کرنا یا تنبیہہ کرنا تو ایک دوسرا معاملہ ہے۔ مگر اصل موضوع یہ ہے۔ کہ آیا اس مرید کا دعوٰی حق تھا یا باطل۔ آپ نے بتایا۔ اس کا دعوٰی مشتبہ بہ حق ہے۔ وہ اپنے نزدیک یہ سچ کہتا ہے۔ مگر اسے حقیقت حال میں شبہ ہے۔ اور اس کام کا اصل راز اس نے دریافت نہیں کیا۔ اور حقیقت کو واقعی بچشم سر دیکھا ہے حقیقت یہ ہے۔ اس کی باطن کی بصیرت اس کے روزنِ بصر سے ظاہر ہوئی۔ اور جب بصری نظر نے اس کی بصیرت کو دیکھا تو اسے یہ گمان ہوا کہ اس نے حقیقت کو بچشم سر دیکھ لیا ہے۔

مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ ۝ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانِ
دو دریا یہاں تک بہتے گئے کہ انکے درمیان ایک حجاب ظاہر ہو گیا۔ اور ایک دوسرے کا پانی باہم نہیں ملتا۔

جونہی حضرت غوث الاعظم رضؓ نے یہ بات لوگوں کو ذہن نشین کرائی

تو اکثر لوگ ہوش کھو بیٹھے۔ بعض تو دیوانہ وار بیابان و صحرا کی طرف نکل گئے۔ کیونکہ جو شخص سچی اور صاف بات کہتا ہے۔ اس کے اندر ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔

وصالِ ہشتم

عقل اور نقل کے باہمی روابط

پھر رشتۂ سخن ہاتھ سے نکل گیا، اور بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچی ہم بیان کر رہے تھے، کہ عقل کو اسرارِ ایمان۔ احوالِ آخرت، عجائبِ ملک و ملکوتِ الٰہی اور حقیقتِ اوامر و نواہی میں بلا تعلیمِ شرع اور وحیٔ آسمانی قطعاً حرفِ رسائی نہیں صحیح راہ یہی ہے۔ کہ ہم عقل کو نقل کے تابع رکھیں۔ اور عقل پر اعتماد اور بھروسہ نہ کریں۔ اور نہ ہی یہ ہماری راہ نمائی کے لئے حجت قرار دی جا سکتی ہے۔ اور عقلی دلائل اور لاطائل مباحث میں الجھنے کی بجائے خدا کے بندے بن کر اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا معمول بنا لیں۔

نہ انگیختن حجت از کار تو ‏ ‏ ‏ زباں تازہ کردن باقرار تو

ہمیں مسلکِ اہلِ سنت و جماعت کی طرح ان معاملات میں درستگی اور راستی سے کام لینا چاہیے۔

اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ۔ ‏ ‏ جو لوگ میرے عقیدے اور میرے صحابہ کے مسلک پر ہیں۔

وہی نجات یافتہ ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

اِلَّا وَاحِدَۃً مِنْھُمْ   مگر ان فرقوں میں سے ایک فرقہ نجات یافتہ ہے۔

تمام ائمہ دین و مشائخ طریقت جو اپنی شہرت و کمال سے کائنات میں نامدار ہوئے ہیں۔ اور جس کا تذکرہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ جبتک یہ کائنات قائم ہے۔ اسی مسلک پر رہیں گے۔ اور ان کی اعتقادی رائیں اسی فرقہ پر تھیں اور ان کا اسی پر اعتقاد تھا۔ یہی وجہ ہے۔ آج تک کوئی بھی بداعتقاد اور اہلِ بدعت سے مقام ولائت پر نہیں پہنچا۔ اور نہ ہی اس کا دل نورِ ولائیت سے منور ہوتا ہے مشائخ متقدمین فرمایا کرتے تھے۔ کہ بداعتقادی اور بدعت کی سیاہی خواہ نورِ ہدائیت اور ولائیت کے مانع ہے۔ خواہ یہ بداعتقادی عملی ہو یا محض نظریاتی جب تک دل بدعت اور بدعقیدگی کی سیاہیوں سے پاک نہ ہوگا۔ اور کتاب و سنت کے ساتھ اس کا پورا اعتقاد نہ ہوگا۔ اسرارِ حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اور نورِ یقین کی شعاعیں اس پر جلوہ فگن نہیں ہو سکتیں

جمال شاہد قرآن نقاب آنگاہ بکشاید
که دارالملک ایمان را بیابد خالی از غوغا

وصال ہم

شریعت طریقت اور علمائے دین و صوفیائے طریقت میں ہم آہنگی

یہ خیال بڑا ہی ناپختہ ہے کہ ہم طریق تصوف کو شریعت اور قرآن و سنت کے مخالف سمجھنے لگیں۔ حاشا و کلا ان دونوں چیزوں میں کوئی مغائرت یا اختلاف

نہیں ہے۔ ملت اسلامیہ کے خاص الخاص اراکین تو صوفیائے کرام ہیں۔ یہ لوگ نورِ سنت کا استنباط کرتے ہیں اور حجاب حقیقت کو اٹھاتے ہیں۔ سلوک طریقت پر عملاً اور حالاً چلتے ہیں۔ حقائق کی تحقیق ان کے ہاں ہی پائی جاتی ہے۔ اس پر یقین رکھتے ہیں۔ نفس کے مکر کی صراحت ان کے ہاں پائی جاتی ہے اتقائے اور تہذیب اخلاق کی واقفیت میں یکتا ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں تزکیہ ظاہر تصفیہ باطن، تخلیہ قلب اور تزکیہ روح میں کوئی دوسرا طبقہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور انہیں جس طرح اعمال و احوال، اخلاق و مقامات، وجد و ذوق، نکات و اشارات غرضیکہ انسانی اخلاق کے کمالات حاصل ہیں کسی دوسرے طبقہ میں نہیں پائے جاتے۔

شیخ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ علم حدیث میں علمائے متاخرین میں سے اہم شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے عقائد میں لکھتے ہیں۔

وَنَعْتَقِدُ اَنَّ طَرِيقَ الْجُنَيْدِ — ہمارا اعتقاد ہے۔ کہ حضرت جنید بغدادی اور

وَصَحْبِهٖ طَرِيقٌ مَقْوَمٌ۔ — انکے رفقائے طریقت بڑے پختہ ایمان تھے۔

---

(۱) شیخ جلال الدین سیوطی (۸۴۹ - ۹۱۱ھ) اپنے عہد کے نہایت باکمال ائمہ دین میں سے تھے درس و تدریس، تصنیف و تالیف، افتا و قضا رشد و ہدایت میں انہیں کمال حاصل تھا۔ آپ نے قرآن کی تفسیر و تشریح پر جسقدر کام کیا وہ اسلامی دنیا کے لئے سرمایۂ افتخار ہے۔ آپکی کتاب "الاتقان" قرآنی علوم و معارف کا بے بہا خزینہ ہے۔ اور علمائے تفسیر نے اس سے بڑا علمی استفادہ کیا ہے آپکے تفصیلی حالات کے لئے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ ضروری ہے۔ "الضوء اللامع لاہل القرن التاسع" تالیف شمس الدین محمد السخاوی۔ حسن المحاضرہ فی اخبار المصر و القاہرہ (جلال الدین سیوطی)، الکواکب السائرہ (عبد القادر عیدروسی)، شذرات الذہب (عبد الحی بن العماد الحنبلی)، مقدمہ نظم العقیان فی اعیان الاعیان (ہٹی)

یہ لوگ کتاب و سنّت کے عامل تھے۔ اور شریعت و طریقت کی تمام ظاہری و باطنی حدود کا احترام کرتے تھے۔ اُنہوں نے کبھی ظاہری شریعت اور باطنی طریقت میں تغافل یا تساہل سے کام نہیں لیا۔ ان حضرات قدس اللہ سرہم العزیز نے لکھا ہے۔

"ہماری طریقت کی بنیادیں کتاب و سنّت پر ہیں۔ جو ان کی مخالفت کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اور ہم اسے منکرِ احکامِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جانتے ہیں۔ اگر ذکرِ الٰہی۔ نماز اور تلاوتِ قرآن پاک میں ذوق۔ حضوریٔ قلب اور خشوع و خضوع حاصل ہو تو فتح الباب کی امید رکھنا چاہیئے۔ اگر یہ چیزیں حاصل نہیں تو کچھ بھی حاصل نہیں۔ جو شخص قرآن و حدیث پر غور و فکر نہیں کرتا ہے علماء و فقہاء کی صحبت سے دُور رہتا ہے۔ وہ بے ادب ہے اور خراب و تباہ ہو گا۔"

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔	فرما دیجئے! یہ میرا راستہ ہے اور اللہ تعالےٰ کی طرف بلاتا ہوں وہی پاکیزہ ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

"عوارف" میں کسی شیخ کا قول نقل کیا گیا ہے۔

كُلُّ حَقِيْقَةٍ رَدَّتْهَا شَرِيْعَةٌ فَهُوَ زِنْدَقَةٌ	جس حقیقت کو شریعت قبول نہ کرے وہ بے دینی ہے۔

اس کے باوجود بعض حضرات حالِ سُکر کے غلبہ میں ایسے کلمات کہہ گئے ہیں

ہیں۔ اور ان سے ایسے اشارات ظاہر ہوتے ہیں۔ جو ظاہری فیصلوں کے خلاف اور شرعی فتوٰی کے برعکس تھے۔ ایسی چیزیں بے ادبی خطاکاری اور خلاف شرع ہیں۔ اور اہل تصوف نے ایسے مبہات اور توہمات قرار دیا ہے۔ ابن منصور حلاج رح نے "انا الحق" کہہ دیا حضرت بایزید بسطامی رح نے "سبحانی ما اعظم شانی" پکارا۔ خواجہ شمس تبریزی رح نے "قم باذنی" کا دعوٰی کیا۔ اور ایک شیخ نے "لیس فی جبتی سواہ" اور "انا ھو و ھو انا" کا اعلان کیا۔ حضرت شبلی رح نے داڑھی کو نورا لگایا۔ اشرفیوں کی تھیلی دریائے دجلہ میں پھینک دی۔ اور نئے کپڑے تار تار کر دیئے۔ حضرت ابو حمزہ خراسانی رح نے کنوئیں میں گر کر کسی کو استعانت کیلئے نہ پکارا۔ اور حضرت ذوالنون مصری رح نے مقام مہلک کو اپنی رہائش کے لئے اختیار کر لیا۔ شیخ ابوالحسن نوری رح مقتل میں خود بخود پہنچ گئے۔ غرضیکہ اس قسم کے ہزاروں واقعات، معاملات ان بزرگان طریقت سے عالم سکر وحال میں رونما ہوتے رہے ہیں۔ اور ان پر ان کا ضبط واختیار نہیں تھا۔ ایسے مواقع پر فقہاء وصوفیاء دونوں برابر ہیں۔ علمائے عظام پر غلبہ احوال رہا۔ اور صوفیائے کرام پر حالت سکر وحال طاری رہی حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ دونوں گروہ قولاً اور فعلاً برگزیدہ تسلیم کئے گئے ہیں کیونکہ صوفیائے کرام نے ایسے معاملات کیلئے اپنے عقیدتمندوں اور مریدوں کو اتباع کی تلقین نہیں کی۔ بلکہ ایسے امور سے منع فرمایا ہے۔ ان کے ہاں بھی اتباع واقتداء کے لائق صرف احکام شریعت ہی ہیں۔ یا طریقت کے وہ قواعد جن کی بنیادیں علم شریعت پر ہوں۔ انھوں نے ایسے امور ذوق وشوق جن کی بنیاد غلبہ حال پر ہے

کے اتباع کی طرف کبھی دعوت نہیں دی۔

فقراء کا ایک طبقہ ایسا ہے جنہوں نے اپنی ظاہری وضع آداب و اصطلاحات اور مستحسنات میں گھوڑوں کے طویلہ کے طریقے اختیار کر لئے ہیں۔ وہ عجیب و غریب لباس پہنتے۔ داڑھیاں ترشواتے ہیں۔ ذکر کی کیفیتیں خلوت گزینی اور سماع کی مجالس رچاتے ہیں۔ غرضیکہ انہوں نے ان باتوں میں علماء و فقہاء کی طرح بڑے اجتہادات اور استنباط کئے ہیں۔ مگر علمائے نے اجتہاد اس لئے کیا کہ سنت بدعت سے جدا ہو جائے۔ مگر ان صاحب حال لوگوں کا اجتہاد کبھی اختلال احوال نہیں ہٹا۔ البتہ وہ صوفیاء اور فقہاء جن کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔ سکر و حال کا شکار ہے۔

اس بات کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے۔ کہ اہل اسلام کے تین طبقے ہیں۔ پہلا طبقہ ظاہر بیں علماء و فقہاء کا ہے۔ ان لوگوں نے تو صوفیاء کرام سے مطلقاً انکار کر دیا ہے۔ اور ان کا کسی قسم کا عذر قابلِ قبول نہیں جانا۔ ایسے علماء صوفیاء کے نہ صرف منکر ہیں۔ بلکہ صوفیائے کرام کے نظریات و خیالات کو حرفِ غلط کی طرح مٹانے کے حامی ہیں۔ اور ان کی تعلیمات و اشارات کو جہل و جنون سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ علمائے ظاہر بیں جو نہی شکست اور افسردہ خاطری کا شکار ہیں۔ نسبت روحانی سے محروم ہیں۔ باطن کی خرابی میں مبتلا ہیں۔ اور پھر بڑی ہی بد قسمتی کی نذر ہو چکے ہیں۔

دوسرا طبقہ ایسے علماء کا ہے۔ جو ظاہری طور پر تو اہلِ طریقت سے انکار کرتا ہے۔ مگر مصلحت وقت کے پیشِ نظر ان صاحب حال بزرگوں کو نذر و

توضیح سے بھی دریغ نہیں کرتے ۔ دلی طور پر وہ اہل طریقت کا احترام کرتے ہیں مگر ان کا دل ان کی زبان کا ساتھ نہیں دیتا ۔ اور سکر و حال کے منکر بھی نہیں ہیں یہ دونوں طبقے دراصل افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں ۔

تیسرا طبقہ ایسے علماء کا ہے ۔ جو مشائخ کے اعتقاد و نظریات کے ہم خیال ہے ۔ ان کے نزدیک اہلِ طریقت کے احوال و اقوال سب درست ہیں ۔ انکے ہاں صوفیاء کے اقوال خواہ خلافِ شرع اور خلافِ طریقِ رسولِ خدا ہی کیوں نہ ہوں ۔ سب صحیح اور درست ہیں ۔ ان کے ہاں علماء و فقہا کی روایات کا کوئی اعتبار اور وقار نہیں ۔ وہ تو مشائخ طریقت کے احکام کو ہی قابلِ عمل سمجھتے ہیں ۔ اگرچہ یہ لوگ ظاہراً شرع کی پابندی کرتے ہیں ۔ فقر کی تعلیمات پر چلتے ہیں ۔ مگر ان کی طرز و روش سے ظاہر ہوتا ہے ۔ ان کا یہ ظاہری عمل غیر صحیح اور ناقابلِ اعتبار ہے ۔ اس فرقہ کو جہلا صوفیا کہا گیا ہے اور ہر دو فریق اول کو کمزور فقہا مانا گیا ہے ۔ اگرچہ فریقِ اول اپنی نادانی اور حماقت کی وجہ سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں لیکن دوسرا طبقہ بھی جہالت و نادانی میں ان سے کم نہیں ۔ اندریں حالات ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں ۔ کہ پہلا طبقہ عرفانِ الٰہی سے محروم ہے ۔ اور دوسرا قوتِ ایمانی سے تہی دامن ہے ۔ چنانچہ پہلا طبقہ قیامِ معرفت سے گر گیا ۔ اور دوسرا طبقہ دائرۂ اسلام سے باہر نکل گیا ۔ کیونکہ منکر کی دستاویز یا تو علم ہوگا یا شریعت ۔ مگر یہ طبقہ دونوں چیزوں سے محروم ہے اور ہر ایک نے افراط و تفریط کی راہ اختیار کر لی ہے ۔

صحیح طریقِ کار اور بہترین اندازِ فکر تو یہ ہے کہ ہم اعتدال کی راہ اختیار

کریں۔ اور اہل علم نے اعتدال و توسط کو ہی بہترین مانا ہے۔ ان تمام امور کا مقصد اور منشا توصیح حال۔ درست اور نسبت اور نیت صادق ہے۔

غلبۂ حال سے ثبات و قرار کے قدم اُکھڑ جاتے ہیں۔ ہوش و حواس جواب دے دیتے ہیں۔ اور ضبط و اختیار چھوٹ جاتے ہیں۔ اندریں حالات شرعی احترام کی صورت حال نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اور عوام کی نگاہ میں شکل معنی۔ عمل روح اور حضور و اخلاص سب معدوم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کیفیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس بات کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب ایک عقل مند اور ہوش مند انسان شدید غصہ یا انتہائے مسرت کے عالم میں اختیار سے ہٹ کر ایسے اعمال کا مرتکب ہو جاتا ہے عام حالات میں ممکن نہیں بعض اوقات غصہ اور خوشی اسے بے خود اور مدہوش کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی صوفیاء کے سُکر و حال کے غلبہ کو تسلیم کر لیں بعید از قیاس نہیں ہے۔

اس قسم کے حالات سکر و حال کی ابتدائی صورت میں رُونما ہوتے ہیں۔ جب یہ لوگ درجۂ انتہا اور مقام استقامت پر پہنچ جاتے ہیں تو ان کا ظاہر و باطن ایک ہو جاتا ہے۔ اور ان پر مستی حال اپنا حکم نہیں چلاتی۔ اور نہ ہی افراط و تفریط کا شکار ہوتے ہیں۔ مگر بعض لوگوں پر یہ حالت آخر تک طاری رہتی ہے جس سے وہ ثبات و قرار اور قدرت و اختیار کے مقام سے ہٹ جاتے ہیں بعض لوگوں کو یہ حالت صفائی قلب و عمل سے حاصل ہوتی ہے اور بعض کو ذہن و عقل سے۔ بعض انوارِ ذکر الٰہی سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بعض غور و فکر سے مگر بعض ایسے بھی ہیں۔ جنہیں یہ حالت مشاہدۂ حق اور روح کی جلا سے نصیب ہوتی۔

یہ تمام کیفیات وحالات صوفیہ کے ہاں صحیح ملنے جاتے ہیں۔ اور ان کی نسبدت بھی درست ہوتی ہے۔ مگر ان حضرات کے وہ اقوال وافعال جو غلبۂ شوق واستیلائے ذوق کے عالم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ شریعت میں قابل قبول نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی اتباع واقتداء کے لئے ضروری ہیں۔ بلکہ یہانتک کہا جاتا ہے۔ کہ ان کے غیر شرعی اقوال وافعال نہ صرف ناقابلِ اتباع واقتداء ہیں۔ بلکہ انہیں معصیت وضلالت پر تصور کیا جائے۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَال۔ حق کے بعد جو کچھ ہے۔ گمراہی وضلالت ہے۔

ہم ایسے اعتقاد کو عین انکار وفساد جانتے ہیں۔ اور ان خیالات کا اظہار صرف اس طبقہ کی طرف کیا جاتا ہے جو صوفیائے کرام کی نسبت جہل وجنون سے کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

ہم اس کے جواب میں عرض کرتے ہیں۔ غلبہ حال میں کسی بات کا ظاہر ہونا معصیت اور مخالفت شرع کیلئے نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی نفسانی خواہشات اور جہالت کے اسباب سے یہ حالات رونما ہوتے ہیں۔ بلکہ استیلائے محبت انتہائے شوق اتباع۔ دیانت۔ تقویٰ۔ علم وعمل۔ صدق نیت۔ حسن وقصد۔ عقیدت واخلاص بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ ان اوصاف سے احوال کا ظاہر ہونا بُری بات نہیں ہاں مگر یہ کہا جائے۔ کہ صاحب حال حضرات حال ووجد کے غلبہ میں امور سرانجام دیتے ہیں۔ وہ جنون کا حکم رکھتے ہیں اور انہیں مرفوع القلم تصور کرنا چاہیئے۔ اگر اس حالت کو کسی صاحب باطن سے نسبت قائم کرلی جائے اور معصیت وخلاف شریعت کا الزام نہ لگائیں تو ایسے امور کی اہل

باطن کے ہاں گنجائش ہے۔ لیکن چونکہ حکم شرع عام ہے۔ اور شرع شریف کے احکام افراد کی وجہ سے بدلے نہیں جا سکتے۔ اور نہ ہی خصوصیت حال سے بعض احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔ نیکی اور بدی تو شارع کے حکم کے تابع ہے۔ وہ کرنے والے کے حال و کیفیت کے ساتھ بدلے نہیں جا سکتے۔ چنانچہ نامشروع امور کے نتائج یقیناً موصوف کو ہی برداشت کرنا ہوں گے۔ اس بنا پر شرع کا فتوے ایسے تمام حضرات پر صادر کیا جاتا رہا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کام تو خطا اور معصیت ہوتا ہے۔ مگر فاعل کو خطا کار اور عاصی نہیں کہا جا سکتا۔ حضرت آدم کا گندم کھانا معصیت تھی۔ مگر آپ کو عاصی کہیں نہیں کہا گیا۔

وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی۔ (حضرت آدمؑ نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور راہ کو بھول گئے) مگر یہ کہیں نہیں فرمایا کہ کانَ مِنَ الکٰفرین یا غاوین کہ بلکہ بطور عذر آپ سے ارشاد کیا گیا۔

فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (ہم نے معاف کر دیا اور اس کا ارادہ اس معصیت میں تھا) چنانچہ غلبۂ حال میں بھی نسیان اور بلا قصد امور ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ مشائخ کی خطاؤں کو بھی۔ ہم انبیاء کرام کی لغزشوں کی روشنی میں دیکھیں گے

چونکہ انبیاء کرام معصوم عن الخطا ہیں۔ ان کے مبہمات کو قرآن کے متشابہات سے تشبیہ دیتے ہیں۔

وصال دہم

اولیاء اللہ کی لغزشیں اور زلات

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اولیاء اللہ کی خطائیں۔ انبیاء کی لغزشوں کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ بات تشبیہہ و تمثیل کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ ورنہ کسی کو انبیاء کرام کے احوال و مقامات سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ ولائت نبوت کا سایہ ہے۔ جو صفات کسی شخص کی ذات میں ہوں۔ اس کے سایہ میں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن حقیقت کی ذات کے سارے صفات سایہ میں ہرگز نہیں آسکتے اور تابع اپنے متبوع کے ہم پایہ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اولیاء اللہ کے سارے کمالات انبیاء کرام کی اتباع کا نتیجہ ہیں۔ مشائخین کا قول ہے۔ کہ مومنین کی ارواح اولیاء اللہ سے اقتباس نور کرتی ہیں۔ اور اولیاء اللہ کی ارواح انبیاء کرام کے ارواح سے فیضیاب ہوتی ہیں۔ اور انبیاء کرام کی روحیں حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفیض ہوتی ہیں۔ اور روح خاتم الانبیاء حضرت ذات باری تعالیٰ سے مستفیذ ہوتی ہے۔

جناب غوث الاعظمؒ فرمایا کرتے تھے۔ اولیاء اللہ مشاہدہ حق کرتے ہیں۔ تو انبیاء کرام کلام کرتے ہیں۔ انبیاء کو وحی آتی ہے۔ اولیاء اللہ کو الہام ہوتا ہے وحی چونکہ کلام الٰہی ہے۔ اس کے ساتھ روح الامین (یعنی حضرت جبرائیل) آتے ہیں۔ وہ آفتاب کی طرح روشن ہوتی ہے۔ اس کی تصدیق واجب اور انکار کفر ہے

مگر الہام حدیث الٰہی ہے۔ اور وہ قلب ولی مومن پر نازل ہوتی ہے۔ کلام اللہ ظاہر و باطن پر حاوی ہے۔ مگر حدیث اولیأ صرف باطن میں کارفرما ہے تکذیب وانکار کلام کا کفر ہے۔ اور اس سے ظاہری اور باطنی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اور حدیث اولیأ سے باطن میں خرابی و تباہی آتی ہے۔ فعیاذ باللہ۔

متکلمین و متحققین اس بات پر متفق ہیں کہ صوفیا میں سے کوئی ولی نبی کے رتبہ پر نہیں پہنچ سکا۔ یہ بات جو مشہور کر دی گئی ہے کہ الولایۃ فضل من النبوۃ (ولایت نبوت سے بہتر ہے)، ہم نے اس قول میں تحقیق کی تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ، جس کا یہ کلام ہے۔ اگر اس کا مقصد ولی کی نبی پر افضلیت سے ہے۔ تو یہ بات محض لغو اور باطل ہے اور اہلِ حق کے مذہب کے خلاف ہے۔ البتہ اگر کوئی تاویل یا اشارہ دوسرا ہے تو وہ ایک علیحدہ بات ہے۔

زلاّتِ انبیاء کے متعلق دم نہیں مارنا چاہیئے۔ اور اسکی اصل حقیقت تک رسائی کرنا ہے کہ یہ کیسے ہوئی اور کیونکر ہوتی۔ ہمیں تو صرف اسی قدر جاننا ضروری ہے کہ زلّت سے مراد لغزش ہے۔ مثلاً ایک شخص چلا جا رہا ہے۔ اور نیت بھی نیک ہے اور ارادہ بھی درست ہے۔ مگر غفلت اور بے احتیاطی کی وجہ سے اس کا پاؤں کانپ کر لڑکھڑا یا۔ تو اس کیفیت کو اہلِ لغت نے زلّت کہا ہے۔ چنانچہ زلّت کے معانی لغزش ہونگے۔

ہم انبیاء کرام کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان سے لغزش رُونما ہو سکتی ہے۔ یا احتیاط کا دامن ان سے چھوٹ سکتا ہے کیونکہ ان لوگوں کے

معاملات ہماری عقل سے بہت بلند اور قیاس سے وسیع تر ہیں۔ شیطان کی ریشہ دوانیاں، نفس کی سرمستیاں اور طبیعت کی خباثتیں انبیا علیہم السلام سے دُور رہتی ہیں۔ اور ان کے سینے نورِ معرفت سے معمور ہیں۔

حدیث شق القمر اسی دعوٰی کی دلیل ہے۔ مگر نورِ نبوت کی لطافت اور نظافت کے ساتھ بعض جزئیات نفس کو بھی نگاہ میں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ان چیزوں کی صفات کا اظہار بھی وحی اور احکام شریعت کے عین مطابق ہوتا ہے عوارف میں اس بات پر تفصیلی بحث دیکھی جا سکتی ہے۔

صاحب عوارف نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم کا یہ سوال رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (یعنی اے اللہ مجھے دکھا کہ مُردے کس طرح زندہ کئے جاتے ہیں) حضرت موسٰی علیہ السلام کا یہ سوال رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (اے اللہ میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں) ایسے تمام سوالات غلبۂ حال اور قرب کی مسرت کی بنا پر ہوتے ہیں۔ اس قسم کے سوالات درگاہ حضرت رب العزت میں غلبۂ حال یا قرب الٰہی کے بغیر اُٹھائے ہی نہیں جا سکتے۔

جناب سرورِ کائنات محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپردۂ اقامت میں کسی قسم کے غلبہ کو رسائی نہیں ہو سکی۔ اور نہ ہی کسی کی سُکر یا مستی اپنا رنگ جما سکی۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (نہ نگاہ بہکی اور نہ حد سے گذری) کو دیکھا جائے تو آپ نے دوسرے انبیاء کی طرح کسی قسم کا سوال نہیں کیا۔ اور اگر کسی استفسار کی نوبت آئی بھی ہے۔ تو بڑے ادب اور تعظیم سے اشارہ کر دیا گیا۔ اور فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ (اے اللہ ہمیں تمام اشیاء کی حقیقتیں

ظاہر کردے۔ تاکہ ہم ان سے نفس الامر کو معلوم کر سکیں۔ اگر تحقیقی نظر سے دیکھیں تو اس آیت کا مضمون و مفہوم رب ارنی کے مضمون و مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن یہاں حقیقت وکنہ کی رویت کی طلب کی گئی ہے۔ اور یہ کہا گیا کہ حقائق اشیاء کما حقہٗ کی وضاحت کر دی جائے۔ یہ بات کمال وسعت حوصلہ اور قابلیت واستعداد کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا جوہر خاص ہے۔ جس میں کسی دوسرے کو ہمسری حاصل نہیں۔

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی!

اس مقام پر کسی بزرگ نے ایک بڑا لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ اس نکتہ میں نعت رسول مقبول اس انداز سے پیش کی گئی ہے کہ اب دوسرا کوئی کیا بیان کر سکتا ہے (اللہ تعالٰے کی رحمت اس پر ہو) آپ نے حقائق کو جمع کا صیغہ بیان کیا ہے۔ یعنے حقائق الاشیاء نہ کہ حقیقت الاشیاء۔ اس میں رعایت ادب اور پردے کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ تاکہ سخن سربستہ اور راز نہفتہ راز ہی رہے۔ اگر حقیقت الاشیاء کہا جاتا تو اس سے مراد حقیقت حق سے ہوتی۔ اس صورت میں رعایت ادب فوت ہو جاتی جس طرح حضرت موسٰی علیہ السلام سے ہو گئی۔ اگر راز افشا ہو جاتا تو پردہ فاش ہو جاتا۔ اور مقصود بالذات تو یہی حجاب تھا۔ یا وحدت فی کثرت کے مطالعہ کی طرف اشارہ تھا یہی مطالعہ معرفت و شہود کے اکمل مراتب سے سمجھا جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے۔ کہ آپ نے ادنا فرمایا تھا۔ اذنی نہیں فرمایا۔ اس

لطیف اشارہ کا مقصد یہ تھا کہ غربائے امت کو بھی حصہ مل سکے۔ اس جگہ بھی ان مطالب کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ جو واقعہ قیامت میں نمایاں ہونے ہیں۔ تمام لوگ نفسی نفسی کہیں گے۔ اور آپ کی زبان پر امتی امتی ہوگا جس طرح تمام مخلوقات کے فہم و ادراک کمالات انبیاء علیہم السلام کو پا لینے سے قاصر ہیں۔ ویسے ہی تمام انبیاء کرام کے افہام و ادراک کمالاتِ ذات مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنے میں ناکام ہیں۔ انبیاء کرام کے کمالات محدود و معین ہیں۔ مگر کمالات مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم تعیین و تحدید نہیں اور عقل و دانش آپ کے کمالات کا محاسبہ کرنے سے قاصر ہے۔

اصمعی علمائے لغت کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ سے کسی نے اس عبارت کے معنی دریافت کئے۔

اِنَّہٗ لیغان عَلٰی قَلْبِیْ وَ اِنِّیْ لَاَ سْتَغْفِرُ اللّٰہَ کل یَوْمٍ سَبْعِیْنَ مرۃ وفی روایۃٍ مِائَۃَ مرۃً	وہ ہر لحظہ میرے دل پر ایک حجاب ڈالتا ہے۔ اور ہر لحظہ ستر بار مغفرت کا خواستگار ہوں۔ ایک روایت میں سو بار کہا گیا ہے

سوال کرنے والے نے پوچھا کہ 'عین' جو لفظ 'لیغان' میں آیا ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا۔

ان سالت عن غیر قلب رسول اللہ وغینہ لقلتہٗ	اگر تم قلب مصطفٰی کے علاوہ معلوم کرنا چاہتے ہو یا تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کے غین کے علاوہ بات کرتے تو میں بتاتا۔ لیکن یہاں تو عین پر غین ہے (یعنے ہماری آنکھوں پر پردہ ہے)۔ لہذا میں غین کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اصمعی کا انکسار و عجز ہی اس کے علم کی علامت و دلیل ہے۔ اگرچہ اس کا

یہ کہنا کہ میں نہیں جانتا نصف علم ہے۔ مگر دوسرے مقام پر اِدراک اس کے مکمل علم کی علامت ہے۔ علم کا اقرار و دعویٰ ہی جہالت ہے۔ اور اعتراف جہل و عجز علم ہے۔

اب ہم اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ عین ایک حجاب ہے۔ جو ہمارے دل پر چھایا رہتا ہے۔ یہ حجاب صرف استغفار سے ہی دور ہو سکتا ہے۔ اس کی دو سری قسمیں ہیں۔ ایک وہ حجاب ہے جو غافلین کے دل پر ہوتا ہے۔ تہ بتہ پر کثیف ہوتا ہے۔ اور یہ لوگ کبائر گناہوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ مگر دوسری قسم ایک معمولی حجاب کی ہے۔ یہ حجاب انبیاء و اولیاء تک کے دل پر ہوتا ہے۔ حجاب کثیف کے لئے توبہ لازمی ہے مگر حجاب لطیف کے لئے اللہ کی طرف رجوعِ صادق لانا ضروری ہے۔

اگرچہ ہمارے علمائے حدیث نے اپنے علم و دانش اور معرفت آگاہی سے جہاں تک ہو سکا چہرۂ مجبوب سے غبارِ معنیٰ صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بڑے بڑے لطیف معانی اہلِ دل کے لئے رشتۂ قلم میں پرو کر پیش کئے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ رازِ جسیم اغیار سے مستور ہی رہا اور جمال شاہد حقیقت ہماری عقل کی ظاہر بین آنکھوں سے اوجھل ہی رہا۔

ایک عالم نے فرمایا کہ عین ایک باریک سا پردہ ہے۔ جو تقاضائے بشریت عوام الناس میں ہے۔ اور ملت و دین کے انتظامی معاملات میں مصروفیت کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور پر بھی ایک لمحہ کے لئے اس پردہ کا سایہ پڑا۔ تو آپ پر ایک لمحہ کے لئے حالت طاری

ہو گئی۔ اور آپ آتش ذکر کی شعلہ زنی اور نور وحدت کے ظہور سے قدرے مضمحل ہو گئے۔ آپؐ نے حسنات الابرار سیئات المومنین کے لئے استغفار پڑھا چونکہ نیک لوگوں کی نیکیاں بھی مقربین کی بُرائیاں سمجھی جاتی ہیں جیسے عوام الناس اگر جامہ و دستار کے بغیر بھی بادشاہ کو سلام کہہ دیں۔ تو مضائقہ نہیں۔ مگر مقربان دربار کیلئے یہی بات سوئے ادب کے مترادف ہے۔

ایک اور بزرگ نے ایک دوسرا لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ پردۂ غین بوجہ غم امت تھا۔ اور آپ کا استغفار کرنا امت کی بخشش کے لئے تھا۔ بعض صوفیاء کرام نے ھٰذا غَین الا نوارِ لا غین الا غیار یعنی پردۂ غین جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا وہ بس انوار کیلئے تھا۔ یہ شفق اغیار کے لئے نہیں تھا۔ کیونکہ یہ انوار اگر عارفوں پر بھی ظاہر کر دیئے جائیں تو وہ اس کی تاب نہیں لا سکتے اور مستی و جدان کے عالم میں پکار اُٹھتے کہ ہم جس طرف نگاہ اُٹھاتے ہیں۔ خدا کو آشکارا دیکھتے ہیں۔

ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کی۔ کہ حضرت صمدیت کی انتہائی قربت کے باوجود بھی نور کے ستر ہزار پردے درمیان میں حائل ہیں۔ مگر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان تمام پردوں کو ایک لمحہ میں طے کر لیا۔ بلکہ ان پردوں سے بہت اوپر چلے گئے پھر تھوڑے توقف کے بعد فوراً اپنے قیام اوّل پر تشریف لے آئے اور مقام ثانی پر پہنچنے پر استغفار کرتے رہے۔ تجلیات الٰہی کے خاص مشاہدہ اور قرب نے

ملا۔ حجاب غینی اور دینی کے متعلق حضرت شیخ الہجویری داتا گنج بخشؒ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں بڑی عمدہ بحث کی ہے اور تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔

خاص ترقی حاصل ہوئی۔ یہ کیفیت محض وقتی خوشی اور مسرت ہی ہی نہیں بلکہ آپ ہمیشہ اسی حالت میں رہتے تھے۔ کیونکہ تجلیات الہی کی نہ حد و نہایت ہے اور نہ ہی اس کا کوئی پیمانہ غائیت ہے بس یہاں ہی غین (حجاب) عین (مشاہدہ) بن گیا۔ اور پردہ پڑتا تو کیا۔ پردہ اُٹھ گیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا۔ کہ اِنَّ لِلّٰہِ سبعینَ الف حجاب مِن نُور (فی الحقیقت اللہ کے لئے نور کے ستر ہزار پردے ہیں) ایک اور حدیث میں ہے۔ وَمَا مِنَّآ اِلاَّ لَهٗ مُقامٌ مَّعلُومٌ کہ جبرائیل امین اس کے لئے ایک خاص مقام مقرر ہے۔ اس میں ترقی اور برتری نہیں ہو سکتی۔

اگر یک سر مُوئے برتر پَرم   فروغ تجلّی بسوزد پَرم

مگر جناب رسالتمآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات ہمیشہ ترقی پر رہتے ہیں۔ تجلیاتِ الٰہی میں آپ کے مشاہدات کا کوئی حد و حساب نہیں ازل سے لیکر ابد تک مشاہدات جاری ہیں۔ بعض محدثین نے اس غین (حجاب) کی کیفیت کی دو وجوہ بیان کی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ بصیرت نبوی پر ان حجابات کا اطلاق ایسے ہی ہے۔ جیسے آنکھوں پر پلکیں ہوں۔ جو ظاہراً بینائی اور بصارت میں مخل نہیں ہوتیں۔ اس کی بجائے وہ آنکھوں کی بینائی کی حفاظت و نگہبانی کیلئے ہوتی ہیں۔ اور بیرونی گرد و غبار کو دھو دیتی ہیں۔ اور ہر قسم کے ضرر سے بینائی کو محفوظ رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ قلب مصطفٰے کی آنکھ پر ایسا لطیف پردہ (غین) موجود ہے۔ جو اسے انفاسِ اغیار اور کثرتِ غبار کے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور آئینہ بصیرت کو زنگ سے بچائے رکھتا ہے۔ چنانچہ

چنانچہ اس پردے کی وجہ سے آئینۂ دل کدورت کے غبار سے محفوظ رہتا ہے بایں ہمہ آپ ہمیشہ استغفار فرماتے اور معذرت چاہتے تھے۔ اور فرطِ محبت اور افراطِ شوق سے ایک لمحہ کیلئے جمالِ باکمال محبوب سے محروم نہ رہتے تھے۔

رفتے زمین زتیرگیٔ منکرانِ عشق
محتاج شست و شو دگر شد کجاست نوح

دوسرے یہ کہ سرورِ کائنات کی روح کی ترقی اور شوق اس بات کا تقاضا کرتا تھا۔ کہ وصالِ الٰہی اور ملاقات ملک الموت حاصل ہو۔ آپکا قلب روح کے تابع اور نفس کے تابع قلب تھا۔ اور بلاشبہ روح کی حرکت اور دل کا قصد ہے۔ حرکتِ نفس سے کامل تر ہے۔ اس لئے نفس ترقی اور مقام قرب خداوندی میں روح اور قلب کی رفاقت اور صحبت سے جدا رہا اور اسی وجہ سے تمام دنیوی علائق ٹوٹ گئے اور ہیئت عنصری جاتی رہے۔

الغرض حکمتِ بالغہ الٰہی اور صحت کاملہ انتہاہی مخلوقات کے مکمل کرنے کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ اور اس غین (حجاب) پڑنے کی وجہ سے حرکت قلب میں قدرے دیر ہوتی۔ تاکہ کلیتہً روح کی طرف نہ جائے۔ اور عالم قدس کی طرف نہ پڑے۔ اور یہ تعلق بالکل ہی ختم نہ ہوجائے۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کمال شوق اور اس عالم کی انتہائی کشش کے باوجود امت کی تکمیل و ارشاد کیلئے استغفار فرماتے رہے اور عذر چاہتے تھے۔ مندرجہ بالا دونوں وجوہات حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی تھیں اور طیبی نے شرح مشکوٰۃ میں نقل بھی کی ہیں۔ وجہ اول کی نزاکت اور وجہ ثانی کی

کی نفاست میں کلام نہیں کی جاسکتی۔ مگر اس کے باوجود ہمیں۔ اصمعی کا بیان سب سے زیادہ پسند آیا۔ اور بہت ہی دلنشیں رہا۔ قلب مصفّی میں ادب کی جو شان جھلکتی ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ اس ادبی مقام کا حال بجز خدائے پروردگار کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔

بہر حال جس بزرگ نے اس موضوع پر جو کچھ کہا۔ اپنے اپنے انداز بیاں اور اور اسلوب کلام میں خوب کہا۔ مگر چونکہ یہ مقام بالاتر ہے۔ جو شخص اس کی خبر دے گا۔ اور حقیقتِ حال کو کشفِ خداداد سے معلوم کر لے گا۔ وہ متشابہات کی تاویل میں کامیاب رہا۔ اور اسرارِ حق سے باخبر کرتا رہا۔ بیچارہ اصمعیؒ باوجودیکہ الفاظ کی تشریح معانی میں گرفتار تھا۔ مگر نکتہ آفرینی میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اور ناقابلِ حل عقدہ کو حل کر گیا۔ حقیقت میں یہ معانی لغت کے تتبع کی وجہ سے اسے حاصل ہوئے۔ یہ وہی لغت ہے جسے جناب سرور کائناتؐ کی زباں دُرفشاں نے بیان فرمایا تھا۔ اور دیارِ محبوب کی آب و ہوا نے وہ اثر دکھایا۔ کہ نورِ معرفت اس کے قلب کو روشن کرتا گیا۔

امام علی حکیم ترمذی کہتے ہیں۔ کہ میں نے جوانی کے زمانہ میں جس قدر انوار و آثار حاصل کئے۔ وہ بڑھاپے میں علم و عمل ریاضت و مجاہدہ کے باوجود حاصل نہ کرسکا۔ میں اس حقیقتِ حال سے بہت حیران و پریشان تھا۔ کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کمالاتِ جوانی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے قریب تر زمانہ ہونے کی وجہ سے تھے۔ اس واقعہ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ جب جناب رسالتمآبؐ کے قرب زمانہ کی یہ

برکات ہیں تو حضور کے زمانہ کی برکات کا کیا حد و حساب ہوگا، پردہ سے جمال حقیقت ظاہر ہوگا۔ اور آفتاب یقین نصف النہار پر چمکتا ہوگا۔ اسی مقام سے ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت کا اندازہ کر لینا چاہیئے۔

"قوت القلوب" میں لکھا ہے۔ جس شخص کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر ایک نگاہ کی سعادت ہوئی۔ یا سرکار دو جہاں کی بارگاہ کی طرف ایک قدم اٹھانے کی برکات نصیب ہوئیں۔ اس پر اسرار و رموز کے دروازے کھلے۔ اور اس کو وہ چیزیں میسر آئیں۔ کہ اوروں کو مدتوں ریاضت سے نہ مل سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ غربائے امت اور خاصان بارگاہ نبوی کی فضیلت میں اتنی احادیث و آیات ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہ فضیلتیں ان لوگوں میں بھی برابر پائی جاتی ہیں۔ جو بعد میں آتے اولیائے امت جو حضور صلعم کی معنوی صورت سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ اور انہیں استقامت باطنی نصیب ہوئی۔ بلکہ یہاں تک کہنا چاہیئے۔ آنحضرتؐ کے تمام متوجہیں اور کوئے محبوب کے تمام غربا کو اس نور کامل کا حصہ ملا ہے۔ اور اس آفتاب رحمت دو عالم سے ایک ذرّہ ان کے نصیبوں میں بھی آیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ آپ ساری کائنات کیلئے رحمت تھے بایں ہمہ اگر لوگ اس رحمت کے قدر شناس نہ ہو۔ تو کفران نعمت کی اس بڑی مثال اور کہاں مل سکتی ہے۔

روئے زمین زتیرگیٔ منکران عشق
محتاج شست و شو دگر شد کجا ہست نوحؑ

رحمتِ عامہ سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے ۔ اور نہ ہی حقیقت محمدیہ کو فلکی دَور کی طرح قیاس کرنا چاہیئے ۔ جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں ۔ اور ستاروں کی خاصیتیں اپنے کمال وصفات کو بعض لوگوں پر پھینکتے رہتے ہیں ۔ ہاں امّت محمدیہ ہر صدی کے آخر پر ایک دَور آتا ہے ۔

يُبْعَثُ لِهٰذِهِ الْاُمَّةِ عَلٰى رَاْسِ كُلِّ مِائَةٍ مَنْ يُّجَدِّدُ اَمْرَ دِيْنِهَا

اس امت کیلئے ہر صدی کے بعد ایک ایسا مرد کامل پیدا کیا جاتا ہے جو اصلاح احوال کی کامیاب کوشش کرتا ہے ۔

اب ہم گیارہویں صدی کے آخر پر پہنچ چکے ہیں ۔ دیکھئے یہ سعادت کس کے نام آتی ہے ۔ اور یہ معرکہ آرائی کس کے ذمہ ہوتی ہے ۔ اس عظیم الشان کام کیلئے ایسا مرد کامل ہونا چاہیئے جو اعجاز حقیقت سے واقف ہو ۔ اور نصرت و کامیابی اس کے قدم چومے ۔ اور عوام الناس کو اپنی قوت کار اور قوت تصرف سے اس طرح راہِ راست پر لائے کہ کسی کو سرتابی کی جرأت نہ ہو ۔ خاص کر ان لوگوں کی سرزنش بہت ضروری ہے جنہوں نے حقیقت (دین محمدیہ) کو لہو ولعب سمجھ کر مذاق بنا رکھا ہے ۔ اور حق و باطل میں تمیز نہیں کرتے ۔

حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ

یہاں تک کہ زمین کی وسعتیں ان کیلئے تنگ ہوگئیں اور یہاں تک کہ ان کی اپنی جگہ بھی انکے لئے محدود ہوگئی پھر انہوں نے یہ سمجھا کہ انکے لئے اللہ کے بغیر کوئی پناہ نہیں رہی پھر اللہ تعالیٰ نے (انکی آہ وزاری پر ترس کھاکر) رحمتِ عامہ سے نوازا ۔

(ہدا حاشیہ صہ ۱۸ پر)

(حاشیہ صفحہ ۸) ۱۰۔ شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں اپنے زمانہ کے عوام کی حالت پر کتنی دلسوزی سے اشارہ کیا ہے اور مختصر الفاظ میں اس وقت کی مشکلات اور اصلاح معاشرہ کی عملی تدابیر کی نشاندہی کر دی ہے۔ بگڑے ہوئے معاشرہ میں انہوں نے ایک مجدد جو حقیقت محمدیہ سے واقف اور مضبوط کردار کے مالک کی آمد کی خواہش کے شدید احساس کا اظہار کیا ہے۔ اکبری دور کے علمائے دربار نے شعائر اسلام کو جس طرح مسخ صورت میں پیش کرنے کی مہم کا آغاز کیا تھا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ حلال و حرام حق و باطل میں تمیز مشکل ہو گئی۔ وہ برملا اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ندامت محسوس نہ کرتے اور کسی کو جرأت نہ ہوتی کہ ان کی اس دریدہ دہنی پر آواز اٹھا سکے۔ آپ کو مندرجہ اقتباس سے اس ماحول کا اجمالی تصور سامنے آجائے گا۔

(۱) تمام مذہب اسلام نامعقول اور اس کے ایجاد کرنے والے اور بنانے والے عرب کے وہ چند مفلس بدو قرار پائے جو سب کے سب مفسد اور راہزن تھے۔

شاہنامہ فردوسی کے اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

ز شیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ ملک کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو!

منتخب التواریخ ص ۳۰۷

(۲) چند ہندو اور چند ہندو مزاج مسلمان تو آنحضرتؐ کی نبوت پر صراحۃً اعتراض کرتے تھے۔

ص ۲۱۵

(۳) دیوان خانہ میں کسی کی مجال نہ تھی کہ علانیہ نماز ادا کر سکے۔ (منتخب التواریخ)

(۴) آفتاب کی عبادت دن میں چار وقت صبح و شام۔ دوپہر، آدھی رات میں لازمی طور پر کرتے تھے۔ وہ قشقہ بھی لگاتے تھے۔ (منتخب التواریخ ص ۲۰۵)

(۵) اسلامی احکام کے برعکس سور اور کتے کو ناپاک ہونے کا مسئلہ منسوخ قرار دیا گیا اور شاہی محل کے نیچے یہ دونوں جانور رکھے جاتے۔ صبح سویرے اس کو دیکھنے کو بادشاہ عبادت خیال کرتا تھا۔ (منتخب التواریخ صفحہ ۲۱۶)

(باقی صفحہ ۸ پر)

وصال یازدہم

صوفیائے کرام کی حکایات

اللہ الصمد! میں کہاں تھا۔ اور کہاں تر پہنچ گیا۔ سلسلۂ گفتگو یہاں تک پہنچا تھا کہ مشائخ کی لغزشیں سُکر وحال کے غلبہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ غلبۂ حال میں جو اقوال و افعال ان سے رُونما ہوتے ہیں۔ وہ تقلید و اتباع کیلئے ضروری نہیں۔ اور وہ لوگ ان معاملات میں مجبور و معذور ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ بزرگ ان چیزوں میں بے اختیار تھے ایسے بزرگوں کے چند اجمالی کلمات اور مختصر احوال کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ اور انکی بعض

(حاشیہ نمبر ۸)

(۶) عربی پڑھنا۔ عربی جاننا عیب تھا۔ فقہ تفسیر اور حدیث کے پڑھنے والے مردود و مطعون ٹھہرائے گئے۔ (منتخب التواریخ صـ۲۱۲)

(۷) احمد۔ محمد اور مصطفٰے وغیرہ نام بیرونی کافروں کی خاطر سے اور اندرونی عورتوں کی وجہ سے اس شخص پر گراں گزرنے لگے۔ (منتخب التواریخ صـ۲۱۷)

عوام کی زندگی مندرجہ بالا درباری ماحول میں ڈھلتی جارہی تھی۔ اعتقاد و عمل کے گوشہ گوشہ میں شک و شبہ کا زہر سرایت کر گیا تھا۔ شیخ محدّث نے ان حالات میں اپنے فرائض کو محسوس کیا۔ اور اپنے مخصوص ماحول کی وصلاح میں منہمک ہو گئے۔ زبان قلم پر شدید پابندیوں کے باوجود ہر انداز میں اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔ آپنے جس مجدد الف ثانی کی بعثت کی آرزو کی تھی۔ وہ شیخ احمد سرہندی کی شخصیت میں جلوہ گر ہوئی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی دعوت عزیمت اکبری دربار کی مندرجہ بالا بدعات کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

جزئیات کا اشارۃً تذکرہ کر دیا جائے تو خلافِ معمول نہ ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ ان کے اقوال سے تعرض وقت کے دامن سے وسیع تر ہے اور قیاس اپنی وسعت میں سمیٹنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ رموز و اشارات جو فنا و توحید کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ہر گفتگو کا یہ موقع و محل نہیں۔ ذیل میں چند حکایات بیان کی جاتی ہیں۔ تاکہ ان بزرگانِ طریقت کا طریق کار ہمارے سامنے آسکے۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا بیٹا فوت ہو گیا تو بچے کی ماں نے شدید صدمہ میں اپنے سر کے بال نوچ ڈالے۔ یہانتک کہ سر کے تمام بال نوچ ڈالے۔ حضرت شبلی نے یہ واقعہ دیکھ کر اپنی داڑھی کو فوراً لگا کر سارے بال اڑا دیئے۔ تمام اہلِ بغداد ان لوگوں کی اس حرکت سے بہت برہم ہوئے۔ اور احتجاجاً کوئی بھی انکے اس صدمہ میں شریکِ غم نہ ہوا۔ اور تعزیت سے بھی دستکش رہے۔

آپ کے ایک محرم راز اور بے تکلف دوست نے حضرت شبلی رح کو صورتِ حال پر اظہارِ خیال کرنے کو کہا۔ تو آپ نے کہا میں نے یہ کام اپنی بیوی کو خوش کرنے کیلئے کیا ہے۔ اس جواب سے وہ مطمئن نہ ہوا۔ اور کہنے لگا۔ مجھے حقیقتِ حال سے پوری طرح آگاہ کریں۔ کوئی شخص بھی اپنی بیوی کی خاطر اس طرح ہیئت نہیں بدل سکتا۔ آپ نے فرمایا۔ اگر تم اصرار کر کے پوچھتے ہو تو سنو! بات یہ ہے۔ کہ میں نے حدیث نبوی سنی ہے۔ کہ جو شخص دوسروں کو تبلیغِ حق کرے اور خود عمل نہ کرے۔ تو وہ لعنتی ہے۔ اور اپنے پروردگار کی قربت حاصل نہیں کر سکتا۔ اور اللہ کی رحمت کی نگاہ سے محروم رہے گا میں نے سوچا کہ میرے احباب تعزیت کیلئے میرے گھر آئیں گے۔ اور جب اسم انا للہ و انا الیہ

راجپوت کہیں گے۔ اور ان کا دل اس ذکر سے غافل ہوگا۔ میری تعزیر داری کی وجہ سے انہیں پروردگار سے دوری اور اس کی لعنت ملے تو نامناسب ہے۔ میں نے اپنی ڈاڑھی کو نورہ لگا کر خلقِ خدا کو ایک بڑے نقصان سے بچا لیا۔

یہ لوگ کس قدر صدق نیت کے مالک تھے اور کتنے باحمیت تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی اس قدر عزت و احترام اور مخلوق خدا پر اتنی رحمت و شفقت۔ یہ لوگ اتنے بلند کردار اور اعلیٰ سیرت کے مالک تھے اگرچہ ڈاڑھی کو نورہ لگا کر عند الشرع ایک ناجائز فعل کے مرتکب ہوئے اور عقلی اعتبار سے ظاہر میں نگاہوں میں بھی بے وقار ہوتے۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کا علم و عمل کی بنیادیں تقویٰ اور ریاضت پر تھیں۔ غلبۂ حال بے اختیاری اور مستی کے باوجود بھی صرف ایسے فعل کے مرتکب ہوتے۔ جس سے مخلوقِ خدا کو نقصان پہنچتا۔ قاعدہ یہ ہے کہ اس قسم کی نیت مباح و مستحب ہوتی ہے مگر مکروہ دوام نہیں ہوتی۔ ان حالات ان لوگوں کو مجنون کہا جا سکتا ہے۔ مگر سیاہ کار نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اہلِ وجدان کے امام اور ارباب سکر کے پیشوا تھے۔ انہیں عام لوگوں پر معمول کرنا چاہیئے۔ یہ اس طرح غلبۂ حال میں بے خود و مستغرق رہا کرتے تھے کہ بعض اوقات اپنے آپ کو ہوش میں لانے کے لئے اپنے بال نوچتے۔ پلکیں اکھاڑتے۔ حتیٰ کہ گوشت و پوست تک نوچتے مگر کسی میں آرام نہ آتا۔ اس وقت کے لوگ انہیں دیوانہ کہتے اور مجنون کے نام سے یاد کرتے۔ حالانکہ وہ عاقل زمانہ تھے۔

اَکْیَسُ النَّاسِ اَزْهَدُهُمْ فِی الدُّنْیَا۔ انسانوں میں سب سے دانشمند وہ ہے جو زاہد ترین دنیا ہوں۔

ایسے لوگوں کی دیوانگی اور وارفتگی ہزار عقلیں قربان کی جاسکتی ہے اور کروڑوں جانیں ان کی یگانگت پر فدا ہیں۔

ایک دن حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوبکر مجاہد قدس سرہٗ کے پاس گئے۔ حضرت مجاہد اپنے زمانہ کے واجب التعظیم عالم دین تھے آپ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ اور آپ کی پیشانی پہ بوسہ دیا۔ اور بڑی تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ اس مجلس میں بہت سے علمائے کرام بھی موجود تھے۔ جناب ابو بکر کو کہنے لگے۔ آپ نے بھی کمال کر دیا۔ ایک طرف تو آپ اور بغداد کے تمام شہری انہیں دیوانہ کہتے تھے۔ اور دوسری طرف اتنی تعظیم و تکریم کر رہے ہیں۔ آپ نے بتایا۔ کہ میں نے یہ احترام شبلی کیلئے نہیں کیا۔ بلکہ اپنے آقا و مولیٰ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سنت کی ہے آج رات میں نے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شبلی رح کو آتے دیکھا۔ تو حضور انہیں دیکھ کر اٹھے۔ اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور نہایت شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔ میں نے دریافت کیا۔ یا رسول اللہ۔ آپ شبلی کے اتنی شفقت فرما رہے ہیں۔ وہ اس انعام و کرام کا کس طرح مستحق ہے آپ نے فرمایا۔ شبلی ہر نماز کے بعد یہ آیت پڑھتا اور مجھ پر درود بھیجتا ہے۔

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ تمہارے پاس یقیناً تم میں سے ایک رسول آیا عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ جو تمہاری تکلیفوں کا خیال رکھتا ہے۔

عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ الرَّحِيْمٌ اور مومنین شفقت اور مہربانی فرمایا کرتا ہے۔

ایک[1] دن حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو القا ہوا۔ کہ تم بخیل ہو۔ آپ نے دل میں ارادہ کر لیا، کہ آج جو کچھ میسر آئے گا۔ اس فقیر کو دے دیا جائے گا۔ جو سب سے پہلے نظر آئے۔ چنانچہ اس دن پچاس دینار آئے۔ آپ اپنے ارادہ کے مطابق باہر نکلے۔ تاکہ کسی فقیر کو دیدیں۔ راستہ میں دیکھا کہ ایک نابینا فقیر ایک حجام سے حجامت بنوا رہا ہے۔ حضرت شبلی رح نے پچاس دینار کی تھیلی اس کے پیش کر دی۔ مگر فقیر نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ یہ حجام کو دے دو۔ یہ زیادہ پرہیزگار ہے۔ اور فقراء کا خدمت گزار ہے۔ جب اس نے لینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ تو آپ نے فرمایا یہ تھیلی دیناروں سے بھری ہوئی ہے۔ ضرور نہ

---

[1] - اس واقعہ کو حافظ ابن قیم رالمتوفی ۷۵۱ھ) نے اپنی کتاب جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام علی خیر الانام" میں یہ ہی الفاظ نقل فرمایا ہے۔ جو اہل علم کے ذوق مطالعہ کی نذر کیا جاتا ہے ذکرہ الحافظ ابو موسیٰ ولم یذکروا فی ذلک سوی حکایۃ ذکرھا ابو موسیٰ المدینی من طریق عبد الغنی بن سعید قال۔ سمعت اسماعیل بن احمد بن اسماعیل الحاسب قال اخبرنی ابوبکر محمد بن عمر قال۔ کنت عند ابی بکر بن مجاہد۔ فجاء الشبلی فقام الیہ ابوبکر بن مجاہد قبل بین عینیہ فقلت لہٗ۔ یا سیدی تفعل ھذا ابالشبلی وانت وجمیع من ببغداد یتصورا انہ مجنون؟ فقال لی: فعلت بہ کما رایت رسول اللہ علیہ وسلم فعل بہ وذالک انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام وقد اقبل الشبلی۔ فقام الیہ وقبل بین عینیہ۔ فقلت۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتفعل ھذا ابالشبلی؟ فقال ھذا یقرا بعد صلاتہ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ الی آخر۔ ویتبعھا بالصلاۃ علی۔ و فی

(باقی صفحہ ۸۷ پر)

کیجئے۔ اس کو لے لیجئے۔ آپ کی ضروریات میں کام آئیگی۔ فقیر نے سر اٹھا کر فرمایا شبلی! میں نے تجھے بخیل نہیں کہا تھا کہ تم اپنی خیرات مجھے دیتے ہیں۔ اتنی تیزی دکھاتے ہو۔ جاؤ۔ اس کے پاس لے جاؤ۔ جو خوشی یہ قبول کرے۔ آپ یہ سن کر خاموش ہوگئے۔ اور حجام کے سامنے تھیلی رکھ دی۔ مگر حجام نے بھی تھیلی لینے سے انکار کر دیا۔ اور برملا کہا کہ میں نے اپنے اللہ سے عہد کیا ہے کہ فقراء کی خدمت کا صلہ یا اجرت ہرگز قبول نہیں کرونگا۔ اور یہ ثواب بدل درہم و دینار کی نذر نہیں ہونے دونگا۔ ناچار حضرت شبلیؒ نے تھیلی اٹھائی اور دریائے دجلہ میں پھینک دی۔ اور فرمایا۔

مَا اَعَزَّكَ اَحَدٌ اِلَّا اَذَلَّهُ اللّٰهُ جس کو اللہ نے ذلیل کر دیا ہو اسے اسے کوئی عزیز نہیں بنا سکتا۔

اس مقام پر علماء کی یہ رائے ہے کہ دینار کی تھیلی دریائے دجلہ کی نذر کرنے سے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ اسراف مال کے مرتکب ہیں اور انہوں نے ذرا بھی خیال نہ کیا کہ یہ بات خلاف امر معروف ہے قرآن میں آیا ہے

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا کھاؤ، پیو۔ بے جا خرچ نہ کرو۔

المتوفی ۳۳۴ھ اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کہاں تک اور کس حد تک اس لغزش میں آئے ہیں۔ یہ انہیں کا حصہ ہے۔ کہ ہرچہ بر خود نہ پسندی برائے دیگر پسند

(بقیہ ص ۸۶) روایتہ دانہ یصلی صلاۃ فریضہ الا ویقرأ خلفھا لقد جاءکم رسول من انفسکم الی اخر السورۃ ثم یقول ثلاث مرات۔ صلی اللہ علیک یا محمد قال۔ فما دخل الشبلی سائقۃ حتی عاینہ کو دیعہ صلی تدفذ کر مشاۃ (جلاء الافہام ص ۲۹۰ مطبوعہ ۱۱۱۵ھ

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک دفعہ آپ نے نیا لباس پہنا، تو اس کا دامن چاک کر دیا۔ لوگوں نے دریافت کیا۔ یا حضرت! کیا یہ حکم ہے کہ نیا کپڑا چاک کر دیں۔ فرمایا۔ ہاں! یہ بھی حکم ہے کہ گھوڑوں کی کونچیں کاٹیں اور ان کی گردنیں ماردیں اور ذبح کر دیں۔

یہ اشارہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کے اس واقعہ کی طرف ہے۔ جو قرآن میں ان الفاظ بیان فرمایا ہے۔

فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْاَعْنَاقِ — انہوں نے پنڈلیوں کی طرف ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ اور گردنوں پر ہاتھ جا پہنچے۔

حضرت شبلی نے جامۂ نو کو چاک کرنے کی تشبیہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑوں سے دی ہے۔

مفسرین نے اس واقعہ کی تفسیر یوں کی ہے۔ کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو تازی گھوڑوں کے سمندر کے کنارے پر آنے کی خبر پہنچی تو آپ نے حکم دیا کہ تیز رفتار گھوڑوں کو سمندر کے کنارے پر تیار رکھیں۔ حتیٰ کہ ان کے بچے پیدا ہوئے تو جب ان بچوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ تو حضرت ان کے دیکھنے میں اس قدر محو ہوئے کہ آپ کی نماز عصر قضا ہو گئی۔ آپ نے غلبۂ حال کے جوش میں اپنی اس تقصیر کی تلافی میں گھوڑوں کی کونچیں کاٹیں اور گردنیں ماریں۔

غرضیکہ ارباب سکر و حال کے تذکرہ نگاروں نے اس قسم کی حکایات توکل و توحید کے باب میں نقل کی ہیں۔ وہ اسباب و وسائط سے ہٹ کر

ریاضت اور مجاہدۂ نفس کے بارے میں بہترین مثالیں ہیں۔

امام عبداللہ یافعی رحمۃ اللہ علیہ نے "نشر" میں لکھا ہے کہ حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ کہ میں حج کے لئے خانہ کعبہ کو جا رہا تھا۔ اثنائے راہ ایک اندھے کنوئیں میں جا پڑا۔ میرے نفس نے فریاد کرنے پر آمادہ کر لیا۔ تاکہ کوئی سنکر مجھے باہر نکال لے۔ مگر میں نے سختی سے نفس کی اس خواہش کو دبا دیا اور عہد کر لیا میں ہرگز فریاد نہیں کرونگا۔ اور ایاک نستعین کی روشنی میں صرف اللہ سے استعانت کرونگا۔ اور جبتک اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے خود ہی کوئی سبب نہ بنا دے۔ کنوئیں سے باہر نہ نکلوں گا۔ کچھ عرصہ کے بعد دو آدمی کنوئیں کے سر پر آ پہنچے اور باہم مشورہ کرنے لگے۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کنوئیں کا منہ بند کر دیں۔ تاکہ آتے جاتے لوگوں کی جان کو خطرہ نہ رہے وہ اس کا منہ بند کرنے لگے۔ تو میرا پھر ارادہ ہوا۔ کہ میں فریاد کر کے امداد کے لئے پکاروں۔ تاکہ کنوئیں کا منہ بند کرنے سے پہلے ہی وہ مجھے نکال لیں۔ مگر پھر خیال آیا۔ میں نے تو اپنے پروردگار سے اقرار صادق کیا ہے۔ میں اس عہد کو کسی صورت میں نہیں توڑوں گا۔ میں خاموش رہا۔ اور وہ کنوئیں کے منہ کو بند کر کے چلتے بنے۔

کچھ عرصہ کے بعد بعض لوگوں نے۔ اس کنوئیں کا منہ بند رہنا غیر مفید سمجھ کر از سر نو کھولنے کا ارادہ کیا۔ جب ان کی آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں تو میرے نفس نے مجھے پھر سختی سے آمادہ کیا۔ کہ اپنی بقا کے لئے فریاد کر کے انہیں آگاہ کر دوں۔ مگر میرے دل نے کہا۔ میرا اللہ نفس کی ان کمزوریوں کا خود ہی

علاج کرے گا۔ اور پھر خاموش رہا۔ انہوں نے کنوئیں کی چھت ہٹا دی اور چلے گئے۔

مجھے جنگل میں ایک شیر کی گرج سنائی دی۔ وہ کنوئیں کے کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔ اور اپنا پاؤں کنوئیں کے اندر لٹکا دیا اور مجھے اپنے منہ سے بار بار اشارہ کرنے لگا۔ تاکہ میں اس کا پاؤں پکڑ لوں اور اوپر چڑھ آؤں۔ اگرچہ شیر کا یہ کام عام معمول کے خلاف تھا۔ اس واقعہ کو غیر معمولی خیال کرتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ قدرت کی طرف سے یہ میری رہائی کا سامان ہے۔ میں شیر کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں سے باہر آیا۔ تو ہاتف غیب نے آواز دی۔

يَا اَبَا حَمْزَةَ اَلَيْسَ هٰذَا اَحْسَن نُجِّيْنَاكَ مِنَ التَّلَفِ بِالتَّلَفِ ط

اے ابوحمزہ! کیا ہم نے تمہیں بہترین رہائی نہیں دی اور تمہیں ہلاکت سے بچا لیا۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ کہ آپ ایک گاؤں میں پہنچے۔ تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ شام ہوتے ہی لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں گھس کر دروازے بند کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ آپ نے اس دہشت اور اضطراب کی وجہ پوچھی۔ تو لوگوں نے بتایا کہ یہاں رات کو ایک آدم خور شیر آتا ہے۔ جسے باہر پاتا ہے۔ اٹھا کر لے جاتا ہے۔ ان لوگوں نے اس واقعہ کو اس انداز سے پیش کیا۔ کہ آپ کے نفس نے اس خوف و ہراس سے بچنے کے لئے کسی مکان میں پناہ گزین ہونے کا تہیہ کر لیا۔ مگر ساتھ ہی ان کے دل سے آواز آئی۔ کہ فاعل حقیقی تو خداوند عالم ہے۔ دنیا کے تمام کام تو اس کے ارادہ کے تابع ہیں۔ شیر سے ڈرنا تو بڑی بزدلی ہے۔ اس کے حکم کے بغیر شیر میرا کیا بگاڑ

سکتا ہے۔

لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (ایک ذرہ بھی اللہ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا) — چنانچہ اللہ کا نام لیکر اس راہ پر رات بسر کر دی۔ جہاں سے شیر آیا کرتا تھا۔

علمائے ظاہر نے ایسے مواقع پر جان بچانے کو شریعت کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ اور جو لوگ ایسے حالات میں اپنی جان سے کھیلتے ہیں۔ انہیں خلاف شرع قرار دیا ہے۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ اپنی جانوں کو دانستہ تباہی میں نہ ڈالو۔

حضرت ذوالنون مصریؒ نے اس مشکل یوں حل کیا ہے کہ عوام الناس کے اعتقاد کے مطابق واقعی ایسے حالات میں حفظتی تدبیریں اختیار کرنا ضروری ہیں۔ جن لوگوں کی چشم بصیرت مشاہدۂ حق اور فعل مطلق سے محجوب ہے۔ ان کیلئے ان قاعدوں پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ مگر ارباب توکل و توحید کو یہ اسباب و وسائط قطرہمت سے خارج کر دینے چاہیئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو عین الیقین سے دیکھا ہے۔ اور ان کے عقیدہ میں یہ چیز بخوبی موجود ہے۔ کہ ارادہ الٰہی کے بغیر کوئی کام واقعہ نہیں ہوتا۔ ہمارا پناہ گاہ میں چھپنا یا میدان میں رہنا یکساں ہے۔

اَیْنَمَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ۔ تم جہاں بھی پہنچو گے۔ تمہیں موت آلے گی۔ اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں بیٹھ جاؤ

احمد بن غالب خلفائے عباسیہ میں سے بڑا ہی ظاہر پرست حکمران ہو گذرا ہے۔ اسے صوفیائے کرام سے نہ صرف انکار تھا بلکہ نفرت بھی تھی، اور انکے

احوال و اشغال کو بے دین اور ملاحدہ سے تعبیر کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنی سلطنت میں حکم نافذ کر دیا کہ فقراء کو گرفتار کر لیا جائے اور انہیں قتل کر دیا جائے چنانچہ اس زمانے کے مشہور صوفی حضرت شیخ ابو الحسن نوریؒ بھی گرفتار کر لئے گئے۔ اور تمام صوفیاء اور فقراء کے ساتھ ایک مقتل میں لائے گئے۔ تمام صوفیاء کو ایک صف میں کھڑا کر دیا گیا۔ تاکہ جلاد ان کی گردنیں اڑاتا جائے۔ تمام کے تمام فقراء مہر بلب تھے۔ کسی کو یارائے گفتگو اور اجازت فریاد نہ تھی۔ یکایک حضرت ابو الحسن نوریؒ پر حالت وجد طاری ہو گئی۔ آپ صف سے آگے بڑھے۔ اور جلاد کو للکارا کہ سب سے پہلے انہیں قتل کیا جائے۔ جلاد نے تلوار کھینچتے ہوئے پہلے آپ سے پوچھا۔ کہ آپ، سب سے پہلے جان دینے کو کیوں خواہش کرتے ہیں۔ آپ نے کہا طریق سلوک میں میرا عقیدہ قربان ہونا ہے۔ اگر میری ایک لمحہ زندگی ہی برادران طریقت پر قربان ہو جائے۔ تو اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔ جلاد نے یہ بات سنتے ہی اپنا ہاتھ روک لیا۔ اور خلیفہ وقت جو اس مقتل میں عام تماشائیوں میں موجود تھا۔ کے پاس گیا۔ حضرت شیخ کی بات سنائی۔ خلیفہ وقت نے قاضی شرع سے صورت حال دریافت کی۔ اور حکم دیا۔ کہ جان کی بازی لگانے والے ان صوفیا اور فقراء کے مذہب و عقیدہ کے متعلق مجھے تفصیلی طور پر آگاہ کیا جائے۔ قاضی شہر نے جب حضرت شیخ نوریؒ کو عبادات و معاملات کے متعلق سوالات کئے تو سب کا جواب عین شریعت کے مطابق پایا۔ اور بعد میں ایک بلیغ خطبہ دیا جس کے آخر یہ جملے تھے۔

اما بعد۔ هٰذا افا علمو ان لله عباداً یسمعون بالله وینطقون بالله ویردون بالله ویصدرون بالله ویاکلون ویلبسون بالله

حمد و نعت کے بعد میں بتا دینا چاہتا ہوں۔ ہم اللہ کے بندے ہیں اللہ کے لئے بات سنتے ہیں اللہ کیلئے بات کہتے ہیں اللہ کیلئے آتے ہیں۔ اللہ کے لئے جاتے ہیں۔ اللہ کیلئے کھاتے ہیں اللہ کے لئے لباس پہنتے ہیں۔

قاضی کے دل پر حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ کی گفتگو سے اتنا گہرا اثر ہوا۔ کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر وہ اٹھ کر آپ کو خلیفہ وقت کے پاس لے گیا۔ اور کہنے لگا کہ یہ لوگ بے دین اور ملحد نہیں تو مجھے اس زمانہ میں مسلمان کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا۔

کافران رہ عشقیم اگر انصاف است
صد مسلمان تو اے خواجہ ذیک کافر ما

خلیفہ یہ سُن کر معذرت خواہ ہوا اور تمام کی رہائی کا حکم دیا۔ اس مقام پر علمائے کرام کی رائے ہے۔ کہ حضرت نوری کا وجد اور اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کرنا از روئے شرع نا جائز تھا۔ کیونکہ اپنی جان کو ضائع کرنے کیلئے قدم اُٹھانا۔ ملک غیر جو امانت الٰہی ہے، پر قبضہ اور تصرف کرنے کے مترادف ہے اور انسان کو اپنا بقا یا فنا کا اختیار نہیں دیا گیا۔ اس کو ہر حالت میں حد ادب میں رہنا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے۔ شریعت میں جان کی ہلاکت یا اس میں تعاون کرنے بھی نا جائز ہے۔ اور یہی ادب عبودیت ہے۔ مگر خدا جانتا ہے۔ کہ ان بندگانِ تصوف کے ہاں یہ کیفیت و مستی کہاں سے آجاتی ہے اور کیسے

کیسے اقدام کر لیتے ہیں۔ حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ امام و پیشوائے اہلِ تصوف مانے جاتے ہیں۔ اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم خیال اور ارباب حال و سکر کے سربراہ تسلیم کئے گئے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت جنید بغدادی رح کو معلوم ہوا کہ حضرت نوری رح نے تین روز کچھ نہ کھایا ہے اور نہ ہی کچھ پیا ہے۔ اور نہ سوئے ہیں۔ بلکہ رات دن صدائے اللہ اللہ زبان پر جاری و ساری ہے۔ اور وجد و حال میں سرشار ہیں۔ آپ نے دریافت کیا۔ کہ نمازوں کا کیا کر رہے ہیں؟ لوگوں نے بتایا۔ کہ نماز کے وقت وہ صاحب ہوش دکھائی دیتے ہیں اور نماز ادا کرنے کے بعد پھر ان پر وہی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ الحمد للہ وہ محفوظ ہے اور اس کی حالت ٹھیک ہے۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ" واقعہ غلام خلیل" کے مجمع فقہاء میں تشریف لائے۔ اور ابو ثور کا مذہب اختیار کیا۔ اللہ نے اس مکر و حیلہ سے ان خدا ناترسوں کے شر و فساد سے نجات دی۔ اور آپ کو رہائی ملی۔ واقعہ خلیل یوں ہوا۔ کہ غلام خلیل ایک بہت ہی امیر کبیر آدمی تھا۔ وہ پارسائی کے دعویٰ اور تصوف کی ظاہری شکل کے ساتھ بادشاہِ وقت کے سامنے پیش ہوا اور دین کو دنیا پر قربان کرنے کا ذریعہ بنایا۔ جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بھی ہو رہا ہے۔ ایک اور شخص سمنون نامی جو بڑا ہی خلیق اور مخلص تھا۔ اسے آفتاب اہلِ طریقت و معاملت سمجھا جاتا تھا۔ اسے بغداد میں بڑی شہرت حاصل ہوئی اور ہر شخص کو اس کی طرز اور وضع پسند آئی۔ یہانتک کہ غلام خلیل کو بھی اس

پر رشک آنے لگا۔ اور سمنون کو نقصان پہنچانے کی تدابیر سوچنے لگا۔ اس نے پروگرام یہ بنایا۔ کہ اس پر کوئی تہمت لگا کر اسے بدنام کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک عورت کو تیار کیا گیا کہ وہ ظاہری طور پر سمنون کے عشق کا دم بھرے سمنون نے اسے سخت سست کہا اور اس پر سخت ناراض ہوا۔ وہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آکر اپنی کیفیت بیان کرنے لگی۔ اور کہنے لگی آپ سمنون کو ہدایت کریں کہ وہ مجھے اپنے نکاح میں لے۔ حضرت جنید بغدادی عورت کی اس بات پر بڑے ناخوش ہوئے۔ وہ غلام خلیل کے پاس پہنچی اور سمنون پر زنا کی تہمت لگائی۔ غلام خلیل تو پہلے ہی سمنون سے آزردہ خاطر تھا یہ بات سنتے ہی عورت کو ساتھ لیا۔ اور خلیفہ وقت کے دربار میں جا پہنچا۔ اور سمنون کی شکایت کرکے برہم کر دیا۔ اس نے خلیفہ کو اتنی شدت سے ابھارا کہ وہ حکم دیں کہ سمنون کو زنا کی سزا میں قتل کر دیا جائے۔ مگر اچانک اس کی زبان بند ہو گئی۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ سمنون کی موت دراصل اس کے ملک کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ صبح ہوتے ہی جب زبان کھل گئی تو خلیفہ وقت نے سمنون سے معذرت کی۔ اور سمنون کو آزاد کر دیا۔

حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ جب تک بقید حیات رہے۔ مقام ناز و عتاب میں رہے۔ اور حضرت جنید بغدادی آپ سے کہا کرتے تھے کہ آپ مقام اور مجمع فقہاء و علماء میں گھٹے ہیں اور ہم دیوانوں اور بلاکشان محبت میں آپ پہنچے۔

طبقۂ جنید کے ارباب حال میں سے ایک بزرگ کا بیان ہے کہ ایک صوفی کو ایک رات احتلام ہو گیا۔ نہانے کی ضرورت ہوئی۔ انکی جسمانی حالت

بڑی کمزور تھی۔ اور طبعاً بھی نازک تھے۔ نفس کی اس سستی اور کوتاہی سے نہانے میں دیر کر دی۔ اگرچہ سردی حد سے زیادہ تھی۔ مگر نفس کی سرزنش کی خاطر اپنی بھاری بھرکم گدڑی سمیت ایک یخ بستہ حوض میں گر پڑے۔ اور خوب غسل کیا۔ اور اس بھاری گدڑی کو خشک کئے بغیر ہی اوڑھے پھرے اور اسی میں ہی سوتے رہے۔

علمائے ظاہر نے اعتراض کیا ہے۔ کہ ایسا بھاری خرقہ جس کا اُٹھانا بھی باعثِ تکلیف ہو۔ پہننا مناسب نہیں ہے۔ اس کا جواب ہمارے پاس یہی ہے۔ کہ یہ فعل ایک قسم کی تعزیت نفس ہے۔

ایک صاحب وجد و حال کی کہانی ہے۔ کہ وہ حج بیت اللہ ادا کرنے ہمیشہ برہنہ پا اور پیادہ سفر کیا کرتے تھے۔ اثنائے سفر جنگلے کانٹے لگتے انہیں پاؤں سے نکالنے کی تکلیف نہ کرتے۔ اس تکلیف اور شدت کی گرمی کی وجہ سے آشوبِ چشم کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ اور آنکھوں کو کمبل سے صاف کرتے۔ نوبت بایں جا رسید کہ نظر جاتی رہی۔ پاؤں پھول گئے۔ اور اسی حالت میں فوت ہو گئے۔ صاحب حال بزرگوں کے نزدیک یہ بات تعزیت نفس میں شمار کی گئی ہے۔

ایک دوسرے صاحب حال و وجد کے متعلق مشہور ہے کہ انکے نفس نے پورے تیس سال ایک خاص کھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر آپ نے اس کی بات نہ مانی۔ یہ بھی تعزیت نفس ہے۔

ایک صوفی کئی دنوں سے بھوکا تھا۔ کہ ایک دانہ انگور ملا۔ بحکم اضطرار

زمین سے اُٹھا کر کھا لیا۔ مگر اس سزا میں اپنے نفس کی وہ تعزیت کی کہ کئی سال تک فاقہ کشی کی عقوبت میں گذار دیئے۔ اور ریاضت و مجاہدت میں بسر کرتے رہے۔

الغرض اس قسم کی بہت سی حکایات ہیں جن سے ارباب حال و مگر کی حرکات و سکنات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسے ہی ان بزرگوں کے ریاضت اور مجاہدہ کی باتیں ہیں۔ حقیقت میں یہ لوگ نفس کی ساری بیماریوں کا علاج بخوبی جانتے ہیں۔ اور وہ نفس کی ساری خرابیوں سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ نفس کی طبیعت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ جبتک اس پر سختی نہ کی جائے اور اس کا پوری طرح محاسبہ نہ کیا جائے۔ وہ راہِ راست پر نہیں آتا۔ الغرض اگر کوئی معاملہ اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ تو کبھی اعتدال پر نہیں آئیگا۔ جیسا کہ مشہور ہے۔ جب مصیبت آئے تو پھر سختی گوارا کرتا ہے۔

فقہاء کہتے ہیں۔ نفس پر اس طرح عذاب کمانا اور حرام کو حلال کر کے حدِ اعتدال سے تجاوز کرنا قرآنی و حدیث کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ

اے مومنو، اپنی پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ کرو۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے اور نہ ہی حد سے تجاوز کرو کیونکہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیۂ کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے۔ کہ صحابہ کی ایک جماعت حضور

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا۔ کہ ہم کھانا پینا چھوڑ کر اہل و عیال سے کنارہ کشی کرنا چاہتے ہیں۔ اور صحرا و بیابان میں مجرد زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آیت ایسے ہی حالات میں نازل ہوئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اکثر آیات و احادیث نفس کی رفق و زلات کی حمایت میں ہیں۔ مگر ہمیں قرآن و حدیث کی تعلیم میں نفس و ہوا کی مخالفت بھی ملتی ہے۔ اور ترکِ لذات و شہوات پر بھی دلائل ملتے ہیں۔ اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ریاضات و مجاہدات اور تحملِ شدائد و رنج اور تلخیٔ فقر و فاقہ پر قانع تھے کہ کسی دوسرے طبقہ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بلکہ ان کی ادنیٰ سی کسر نفسی تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ لوگ اپنی عمر میں شکم سیری سے کھانا نہیں کھا سکے۔ بعض جنگوں میں تو یہاں تک نوبت آئی کہ ان بزرگوں کو اونٹوں کی اوجھریاں کھا کر گذر اوقات کرنا پڑی اور ان کے پانی سے حلق تر کرنے پر اکتفا کرنا پڑی۔ اور آرام و آسائش سے کنارہ کش رہے ایسی سختیاں اور ریاضتیں جہاد فی سبیل اللہ کیلئے ضروری خیال کی جاتی تھیں۔

دراصل صحابہ رضی اللہ عنہم جمالِ مصطفےٰ سے اس قدر مطمئن اور سرشار تھے۔ اور ایمانی قوت اور کمال محبت رسولؐ پر بھروسہ کرتے تھے۔ ان کیلئے نہ کوئی حجاب تھا۔ اور نہ ہی اضطراب تھا۔ وہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز تھے۔ اس کے باوجود بھی وہ ریاضات اور محنت شاقہ کو اپنی زندگی کا معمول

بنائے رکھتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ شربت دیا گیا۔ تو آپ نے پینے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا میں ڈرتا ہوں۔ کہ میرا شمار ان لوگوں میں نہ ہو جائے جن کے متعلق أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا۔ کہا گیا ہے۔ اصحاب صفہ پر حوال فقر اور کیفیت تکلیف کس حد تک تھی۔ یہی وجہ ہے۔ کہ صوفیائے کرام نے ان صحابہ کرام کی زندگی کو مشعل راہ بنایا۔

ابولبابہ انصاری رضی کا قصہ اس ضمن میں بہت بڑی دلیل ہے۔ بنی نضیر کا واقعہ بھی اس بحث میں ایک اچھی مثال ہے جب آپکو مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیا گیا۔ اور کھانا پینا چھوڑ دیا گیا۔ وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے بصارت سے محروم ہو گئے۔ اور قوت سماعت سے عاری ہو گئے اور عہد کر لیا کہ جب تک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست رحمت سے نہ کھولیں گے آزادی قبول نہیں کروں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر وہ میرے پاس پہلے آجاتا۔ تو میں اس کے لئے استغفار کرتا۔ اور اپنے اللہ سے شفاعت و سفارش کرتا۔ وہ اول ہی سے درگاہ باری تعالےٰ میں پہنچا اور اس کے سامنے دست سوال دراز کرتا رہا۔ اب جبتک اس کے ہاتھ خود اللہ تعالےٰ نہ کھولے میں نہیں کھولوں گا۔ چنانچہ پورے دس دن گذرنے کے بعد یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس سے ابولبابہ کی توبہ کی قبولیت کی بشارت تھی۔

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ   جن لوگوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف
خَلَطُوا عَمَلًا وَآخَرَ سَيِّئًا   کر لیا اور نیک عمل کو بُرے عمل سے ملا دیا

عَسَى اللّٰہُ اَن یَتُوبَ عَلَیھِم ہے۔ عنقریب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے
اِنَّ اللّٰہَ غَفُورٌ رَّحِیمٌ انہیں دامنِ شفقت میں لے گا وہ
بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیہ کریمہ کے نازل ہونے پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ابولبابہ رض کو آزاد کر دیا۔

اس واقعہ سے ان نکات کو ذہن نشین کرنا چاہیے۔ کہ ابولبابہ رض کا باندھا جانا اور ان کا کھانا پینا ترک کرنا۔ اور قریب المرگ پہنچنے میں کیا کیا اسرار تھے یہ ساری باتیں عین شریعت تھیں۔ اگر ایسی تعزیت نفس۔ شدت مجاہدہ اور ریاضت حرام دنا جائز ہوتی۔ تو جناب رسالتمآب ان حرکات سے منع فرما دیتے اور روک دیتے۔ یہ ساری باتیں سکر و حال کے غلبہ میں ہوئیں۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے غلبۂ مستی و حال کے وقت مسجد نبوی میں آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھدِی مَن یَّشَاءُ لیکن جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ نے قیام حدیبیہ پر صلح کفار سے آنحضرت کو منع کر دیا تھا۔ منافقین نے حضرت عائشہ صدیقہ رض پر جھوٹی تہمت لگائی تو آیات تطہیر نازل ہوئیں۔

حضرت معاذ بن جبل رض کا مشہور قول ہے یہ سارے واقعات بوجہ مستی اور وجد و حال کے رونما ہوئے تھے۔ قلباً و ایماناً یہ لوگ قطعاً لغزش پر نہیں تھے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایسے حالات پر بھی اپنے بندوں پر رحمت وکرم فرمایا۔

وصال دوازدہم

فقرائے ذیشان کی بے سروسامانیاں

مشائخ طریقت میں سے بعض بزرگانِ دین جو سالکانِ مسالک توحید و توکل کے ہو گذرے ہیں۔ نے بیان کیا ہے۔ کہ جو لوگ بلا توشہ و رفیق جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں۔ جہاں جان کو ہر وقت خطرۂ ہلاکت رہتا ہے۔ وہ اکثر اوقات پریشان حال رہتے ہیں۔ فقہا کرام اس موضوع پر بڑی تنقیدی نگاہ رکھتے ہیں۔ اور انہوں نے ان بزرگانِ طریقت کو ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالےٰ نے سامانِ حفاظت اور اسبابِ آسائش مہیا کئے ہیں۔ تو انہیں خواہ مخواہ نظر انداز کر کے اپنی جان خطروں میں ڈالنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ بات سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی ساری مخلوق کی ایک مشترکہ عادت بخشی ہے۔ اور اسباب ظاہری کے ساتھ انہیں ایک خاص ربط عطا فرمایا ہے۔ یہ ربط تین قسم پر ہے۔

(۱) یقینی (۲) عادی (۳) ظنی

یقینی ربط کا ترک کرنا ناممکن ہے۔ بلکہ اس کا تارک گنہگار و سیاہ کار کہلاتا ہے مثلاً کھانے کے لئے لقمہ اٹھانا۔ منہ میں رکھنا۔ چبانا اور نگلنا عادت

بیقینی میں داخل ہے۔ مگر ان کو چھوڑنا تو کل نہیں کہلاتا۔ بلکہ بہت بڑی جہالت ہے۔ اللہ تعالےٰ ان اشیاء سے بعض لوگوں کو سقوط بخش دے تو یہ عادت نہیں۔ بلکہ معجزہ اور کرامت اور خرق عادت کہلائے گا۔

عادی ربط اسے کہتے ہیں۔ کہ کوئی شخص عادتاً یا خلقاً کوئی چیز اختیار کرے۔ یہ عادت طبیعتوں کے اختلاف۔ ہمت۔ ریاضت اور مجاہدہ کی بنا پر مختلف طریقوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص دو یا تین روز تک کھانا نہ کھانے کی عادت ڈال لے۔ یا برگ وگیاہ پر گزر اوقات کرتا چلا جائے یا غلبۂ عشق الٰہی میں نور باطن و یقین کی روحانی غذا حاصل کرتا رہے کسی صوفی سے پوچھا گیا کہ تمہاری غذا کیا ہے۔ تو اس نے کہا۔

ذِکرُ الْحَیِّ لَا یَمُوتُ۔ (یعنی ذکر خدائے لا یموت کا) ان عادات میں سے بعض لوگ ایسی عادت بنا لیتے ہیں کہ وہ ذکر الٰہی اور قدرت خداوندی کو ہی بقائے حیات انسانی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں کھانا پینا زندگی کیلئے کوئی ضروری چیز نہیں۔ بالفرض اگر کوئی شخص دس روز تک متواتر بھوک اور پیاس برداشت کرلے۔ اور برابر دس روز تک سفر کرتا رہے۔ اور پھر اس کے پاس سامان خورد و نوش بھی نہ ہو۔ تو اس کو گنہگار نہیں کہا جائیگا۔ مگر وہ شخص جو ایک دن بھی بھوک پیاس کو برداشت کرنے کا عادی نہیں۔ اسے بھوک و پیاس کو اختیار کرنا گناہ ہے۔

ایک صوفی چالیس روز تک چلہ کشی کرتا۔ اور اس دوران کھانے پینے سے قطعاً کنارہ کش رہتا۔ مگر اس کی طبیعت میں کبھی اضمحلال یا ضعف واقع

نہیں ہوتا تھا۔ غرضیکہ یہ لوگ توکل و یقین کی قوت سے ایسی ریاضت اور مجاہدہ عمل میں لاتے ہیں۔ کہ انہیں مشاہدۂ توحید کی دولت مل جاتی ہے اور ان کی نگاہوں سے اسباب و علل کا پردہ اُٹھا دیا جاتا ہے۔

ایک بزرگ کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ کہ اس نے اپنے خداوند تعالیٰ سے عہد کر لیا۔ کہ وہ دس دن رات تک کچھ نہ کھائے گا۔ یہ عرصہ سفر میں گذر گیا اور اسے سفر کے دوران کچھ میسر نہ ہوا۔ گھبرا کر نڈھال ہو گیا۔ آخر کار نہایت نحیف و نزار حالت میں بارگاہِ الٰہی میں رو رو کر دعائیں مانگنے لگا۔ اے بار الٰہا! میں نے جو مدت مقرر کی تھی وہ ختم ہو گئی۔ اب بھوک برداشت کرنے کی ہمت نہیں رہی۔ تو علیم و دانا ہے۔ میں اب کیا کروں؟ ندا آئی۔ تم کیا چاہتے ہو۔ قوت (طاقت) یا۔ قُوت (خوراک) عرض کرنے لگا میری خواہش ہے کہ مجھے قوت (طاقت) دے۔ خوراک کا میں خواہاں نہیں ہوں اللہ نے اسے قوتِ برداشت دے دی۔ جبتک وہ زندہ رہا۔ قوت ربانی سے وہ روحانی غذا (قُوت) حاصل کرتا رہا۔ اور باقی عمر بغیر کچھ کھائے پیئے شکرِ الٰہی میں بسر کر دی۔

ظنی ربط اسے کہتے ہیں۔ کہ محض وہمی اسباب پر زندگی کا انحصار رکھ لیا جائے۔ اور یہ خیال کر لیا جائے۔ کہ اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔ اور اگر فلاں فلاں چیز نہ ہوگی تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ ایسا خیال محض وہم و گمان ہی ہوتا ہے۔ اس قسم کے اسباب کی پیروی سراسر توکل کے برخلاف ہے۔ مگر ہاں۔ اگر ایسے اسباب کا عادی ہو جائے اور یہ اسباب

کمیاب بلکہ نایاب ہوں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں مثلاً اس جنگل میں دور رہتا جہاں خونخوار درندوں کا مقام ہو۔ بغیر اسباب کے ناممکن ہے۔ مگر جس جنگل میں درندے نہ ہوں۔ اور محض یہ خیال کر لیا جائے۔ کہ اس میں درندے چلے آئیں گے اور اسے چیر پھاڑ جائیں گے۔ محض وہم اور محض وہم ہے۔ اور یہ بات توکل کے منافی ہے ایسے ہی اگر کسی نے خواب میں دیکھا کہ سیلاب اس کے مکان کی بنیادیں اکھیڑ رہا ہے۔ اگرچہ یہ بات عقل اور ذہن کے بڑی قریب ہے اور اس بات کا امکان ضرور ہے۔ مگر خواب کی باتوں کو یقینی حد تک مان لینا وہم ہی وہم ہے ایسی ظنی اور وہمی چیزیں حق و باطل میں صحیح فیصلہ کرنے سے روکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ یقینی طور پر راہِ حق پر لاتا ہے۔ اور صحیح راہ نمائی فرماتا ہے۔

اندریں حالات ارباب کمال کے احوال و اقوال جو صادقانِ راہ اور متوجہان درگاہ ہیں۔ اور علم و تقویٰ اور دیانت پر ثابت قدم ہیں۔ اور وہ لوگ تسلیم کئے گئے ہیں اور مانے گئے ہیں۔ ان لوگوں سے بلا وجہ و ضرورت انکار کرنا خوف و خطر سے خالی نہیں ہے۔ ان سے خوش اعتقادی رکھنی ضروری ہے اور سوئے عقیدت سے باز رہنا چاہیئے۔ جیسا کہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

اَلْاِیْمَانُ بِطَرِیْقَتِنَا ھٰذَا مِنْ لولایۃ	ہمارے راستہ میں ایمان ولایت ہی کی ایک قسم ہے۔

اوسط اعتدال کا راستہ ہی ولایت ہے اور یہی اصل کمال ہے۔

ایکہ از کشمکش قیل و مقال	نیست حالت ارباب کمالی

نشنیدۂ زکساں جسز خبرے ... ہیچ نایافتہ دلہ خود اثرے
قابل کار نے معذورے ... یا خود کوشش آں بس دُورے
باش کیں راہ گذار دگر است ... ہر کسے قابل کار دگر است
لیکن اندیشے انکار مرد ... از جہاں منکر ایں کار مرد
بنگر عالمِ درویشاں را ... کوشش و شورش عشق ایشاں را
کہ دریں راہ چہ طلبہا دارند ... زند طلبہا چہ لقب ہا دارند
زیں طلب گر نہ خدا یافتہ اند ... ایں ہمہ بہر چہ بشتافتہ اند
زیں طلب ایں ہمہ جانبازی چیست ... مال و اسباب فدا سازی چیست
کشف گر نیست قیاس تو کجا است ... عقل کو درک حواس تو کجا است
باورے از پی است تر او جدانے ... معتقد باش و بیا دا ایمانے

وصال سیزدہم

مضامین کتاب قواعد الطریقہ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ

مشائخ طریقت کے کلام سے نقل ہمارے موضوع بیان کے مطابق ہوتی ہے

۱؎ یہ باب حضرت شیخ احمد بن سعید مغربی شہاب الدین کی کتاب "قواعد الطریقۃ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ" سے نقل کیا گیا ہے تا کہ صوفیائے متقدمین کے خیالات و نظریات کا اندازہ ہو سکے کہ وہ شریعت و طریقت کے مسائل کو کس انداز سے حل کرتے تھے۔ شیخ محدث نے ان متقدمین حضرات کے خیالات و اعتقادات کو پیش کر کے اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ کہ صوفیا کے خیالات ہمیشہ قرآن و سنت کے تابع رہے ہیں بعض مستشرقین کا یہ خیال بڑا غلط ہے کہ تصوف عجمی فلسفہ کی

اور طالب سالک کے علاوہ قارئین حضرات بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور تصوّف کی کتابوں میں اس موضوع کی پوری تفصیلات ملاحظہ کی جا سکتی ہے ہم "قواعد الطریقتہ فی الجمع بین الشریعتہ والحقیقتہ" سے بعض مسائل نقل کرتے ہیں۔ یہ کتاب حضرت امام الہمام قدوۃ المتاخرین حجتہ المتقدمین۔ ملقب بہ شہاب الدین سید احمد مغربی برنسی کی تصنیف لطیف ہے۔ آپ اپنے وقت کے اکابر علمائے کرام۔ مغرب کے مشائخ عظام اور اپنے وقت کے مسلم الثبوت ولی اللہ ہو گزرے ہیں۔ تمام اہل تحقیق اور ارباب تدقیق آپ کی تعلیمات و اقوال پر متفق اللکلمتہ ہیں۔

چونکہ اس کتاب کے عنوانات لفظ قاعدہ سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ ہم بھی اس قاعدہ اور ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔ باللہ توفیق وبیدہ ازقتہ التحقیق

قاعدہ ۱ :۔ فقہ کا حکم عام ہے۔ علم فقہ کا مقصد اور مفہوم تمام خواص و عام جانتے ہیں ــــ فقہ سے احکام شریعت اور اعلام دین و ملت کیلئے بہترین کام لیا گیا ہے۔ چونکہ فقہ کی بنیادیں علم دین پر ہیں۔ بدیں وجہ اسکے قواعد اتنے مضبوط اور ٹھوس ہیں کہ چند لوگوں کے اختلافات سے تبدیل نہیں ہو سکتے۔ مگر تصوف کے احکام خاص ہیں۔ اس لئے ان احکام کی پیروی بھی خواص اور اہل قرب کے لئے ہی ضروری ہے۔ یہ معاملہ خدا اور بندے کے درمیان ہے۔ اور اس کی بنیادیں حال و ذوق پر ہوتی ہیں تصوف کے احکام جزئیات پر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیفیاتِ حال و وجد اور ذوق بدلنے

سے بدلتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ فقہ کا حکم صوفی کیلئے بھی یکساں ہے اور صوفی کا فقیہہ کے فیصلہ سے انکار غیر صحیح اور نامناسب مانا گیا ہے۔

بہر حال صوفی کو فقیہہ کی طرف رجوع کرنا نہایت ضروری اور لازم ہے۔ اسے احکام فقہ پر عمل کرنا چاہیئے۔ اور مخالف شریعت کوئی بات نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر فقیہہ کے لئے ضروری نہیں کہ وہ تصوف کے تمام احکام کو نگاہ میں رکھ کر اس کی پیروی کرے۔ اس بات سے یہ معلوم ہوا کہ تصوف فقہ کی محتاج ہے۔ اور فقہ کو تصوف کا احتیاج نہیں۔ بلکہ مستغنی ہے اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ تصوف مرتبہ میں فقہ سے کہیں اعلیٰ واقع ہے۔ مگر فقہ احکام شریعت کی بجا آوری میں بہ نظر مصلحت ارفع اور اہم ہے۔

کُنْ فَقِیْهًا صُوْفِیًا وَلَا تَکُنْ صُوْفِیًا فَقِیْهًا۔

پہلے فقیہہ ہو پھر صوفی۔ مگر پہلے صوفی اور بعد میں فقیہہ نہ ہو۔

پہلے داد فقاہت۔ عمل شریعت۔ حفظِ احکام ظاہر بینا ضروری ہے پھر مقام تصوف و حقیقت کی طرف رجوع کر کے باطنی فیوض حاصل کرنا چاہیئے چنانچہ عملاً اور حالاً یہی تسلیم کیا گیا ہے۔ اور مانا گیا ہے۔ کہ معاملات کو پہلے ہی حقیقت و توحید کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے اور ابتداء ہی میں باطنی طریق کار سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بعد ظاہری شریعت کے احکام کے اتباع میں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

لَا یُقَدِّمُ الْبَاطِنُ عَلَی الظَّاهِرِ
باطن کو ظاہر پہ مقدم نہ کیا جائے

وَلَا یَکْتَفِیْ بِالظَّاھِرِ عَنِ الْبَاطِنِ ۔ اور ظاہر سے باطن پر اکتفا کیا جائے۔
باطنی معاملات کو شریعت کے ظاہری احکام پر مقدم نہیں رکھنا چاہیئے
ایسا نہ ہو کہ مذہب باطلہ میں پہنچ جائے ہوں الحاد اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے
ہاں اگر ظاہری احکام سے راہ نمائی نہ مل سکے ۔ تو اسی پر اکتفا نہ کرلے بلکہ
باطنی قواعد کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے ۔ اور اگر فقہی نتائج راہ نمائی
کرنے سے قاصر ہوں ۔ تو ہاتھ پاؤں توڑ کر مایوس نہیں بیٹھ جانا چاہیئے بلکہ
تصوف و طریقت سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیئے ۔ انوار و اسرار سے محروم
و مایوس نہ ہو ۔ کیونکہ فقہ سے تصوف کی طرف رجوع کرنا نہ صرف آسان
ہے ۔ بلکہ صحیح اور درست راستہ ہے ۔ اپنے ذوق و تجسس سے اس کے لئے
معاملات کو سلجھانے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی ۔ مگر تصوف سے لوٹ
کر فقہ کی طرف آنا ۔ جبکہ حال و ذوق کا غلبہ ہو ۔ بہت مشکل اور دشوار ہے
پہلے فقہ و شریعت سے کام لیکر حقیقت اور معرفت کی بلندیوں کی طرف
بڑھنا چاہیئے ۔ فقاہت مرتبہ اسلام ہے ۔ اور کلام مرتبہ ایمان اور
تصوف مقام احسان ہے ۔

حدیث جبریل میں یہ تینوں مقامات ظاہر ہیں ۔

اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّکَ نیکی یہ ہے کہ اپنے اللہ کی عبادت
کَاَنَّکَ تَرَاہُ یوں کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو ۔

اور حضرت مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ۔

مَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ یَتَفَقَّہْ فَقَدْ جو شخص محض صوفی بن گیا اور فقیہہ

تزندق ومن تفقه ولم | تو بنا۔ وہ دین حق سے پھر گیا۔ اور جو
یتصوف فقد تفسق ومن | صوفی نہ ہو اور صرف فقیہہ ہوا۔ وہ
جمع بینهما فقد تحقق | فاسق رہا۔ اور جس نے ان دونوں

(فقہ و تصوف) کو قبول کر لیا۔ وہ اصل میں محقق ہو گا۔

فقہ کا کمال اور ذوق بڑی ضروری چیز ہے۔ مگر تنہا فقہ یا تصوّف نقص و زوال کا سبب ہیں۔ جیسا کہ علم طب تجربہ کے بغیر کافی نہیں ہے۔ وہ علم طب کے بغیر محض تجربہ بھی غیر مفید ہے۔ ویسے ہی فقہ بغیر تصوف اور تصوّف بغیر فقہ کے غیر مفید چیز ہے۔

قاعدہ ۲ :۔ اصل میں فرق یا امتیاز تذبذب اور بے یقینی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جو طریقہ اختیار کیا جائے۔ اسے تحقیق سے معتبر اور مستند کر لینا چاہیے فرع کو اصل کے ساتھ ربط دینا اسی وقت زیب دیتا ہے جب فتح اسباب نصیب ہو جائے۔ اور اصل مقصد میسر ہو جائے۔ فقہ کلام اور تصوّف میں شیخ۔ امام اور قائد ایک ہونا چاہیے اور جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ :۔

اَلصُّوفِیُّ لَا مَذْہَبَ لَہٗ | صوفی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

یہ بات غلط اور بے بنیاد ہے۔ اگرچہ اس زمانہ میں یہ بات کہنے والے بہت ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے۔ کہ آج تک جتنے آئمہ طریقت اور علمائے ملت ہو گذرے ہیں۔ وہ تمام کے تمام فقہا کے مذہب کے تابع اور پیرو تھے چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ۔ حضرت ابو سفیان ثوری رضی اللہ عنہ کے مذہب پر

تھے۔ حضرت محبوب سبحانی سید عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے مذہب پر تھے۔ حضرت شبلیؒ مالکی تھے۔ حضرت جریریؒ حنفی تھے۔ حضرت محاسبیؒ شافعی تھے۔

یہ عام طور پہ کہا جاتا ہے۔ کہ صوفی عامل حدیث ہوتے ہیں۔ تو اس سے یہ مراد ہے کہ صوفی کا کوئی فعل خلاف حدیث اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہوتا۔ اور کوئی امر خلاف احتیاط اور برعکس شرع و وسع نہ ہونا چاہیئے صوفی کیلئے یہ نامناسب ہے کہ وہ آسان اور آرام دہ کام کرتا ہے۔

قاعدہ ۳۴۔ شرع ہمیشہ اصل اور قاعدہ پر ہوتی ہے اور اصل کتاب وسنت ہے۔ چنانچہ ہر بات خواہ صوفی کی ہو یا فقیہہ کی۔ یا کسی متکلم کی ہو اگر اصل کے موافق ہے تو قابل قبول ہو گی۔ ورنہ اسے رد کر دینا چاہیئے۔ اگر اس کی کوئی بہتر تاویل ہو سکتی ہے۔ تو تاویل کی جائے۔ اور اگر مناسب تاویل نہ ہو۔ تو دیکھنا چاہیئے کہ کہنے والا اپنے علم و ورع میں کس قدر دیانتدار ہے اگر وہ صحیح ہے تو قبول کریں۔ اور اسے خلاف قاعدہ نہیں جاننا چاہیئے کیونکہ مفسد کے فساد کے نتائج آخر کار اسی پر جاتے ہیں۔ اور نیک انسان کی نیکی کبھی نقصان پسند نہیں ہوتی۔ حد سے گذرنے والے صوفیاء اہل ہوا کہلاتے ہیں اور ایسے لوگوں کا قول وفعل قابل تقلید و تسلیم نہیں۔ بلکہ مسترد اور متروک ہے۔ ان کے افعال سے احتیاط ضروری ہے اور جو افعال واقوال اُن سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ اتباع اور پیروی کے لئے ضروری نہیں۔ متبوع حقیقی تو بس صرف شارع علیہ السلام ہی ہیں۔ باقی سب کے سب تابع ہیں۔ اور حجت تو

صرف قرآن و سنت سے ہی لی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جو چیز بھی اس اس کا مستند ہونا غیر یقینی ہے۔

قاعدہ ۳ ۔ اگر طریقت کا ایسا کلام جو دشوار و مشکل ہونے کے باوجود بلا تامل سمجھ میں آجائے تو اس کا حکم قاعدہ ۳ کے تحت آئے گا۔ مگر جو بات واضح اور صحیح ہونے کے باوجود بڑی مشکل اور دشواری سے سمجھی جائے۔ اگرچہ وہ ظاہری کلام ہی ہو۔ اعتبار و وقار کے لائق نہیں ہے۔ کیونکہ تصوف کے کلام میں آسانی مشکل سے ہی ملتی ہے۔ اگر کلام دشوار ہو اور خلافِ قیاس سمجھ میں نہ آئے۔ اور اس کی کوشش بھی مشکوک و مخبوط ہوتی ہے۔

اس باریک مسئلہ کی وضاحت کے لئے یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ عام طور پر کلام میں مشکلات کی وجہ تنگ دامانی عبارت و الفاظ اور وسعت معنی ہوتی ہے کبھی اصل میں فساد اور مطلب میں اختلاف کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔ پہلی وجہ میں مقاصد کی انتہائی نزاکت و بلندی ہوتی ہے۔ ہر چند وضاحت و بلاغت میں کوشش کی جاتی ہے۔ مگر الفاظ کی بے مائیگی اور معانی کی وسعت ان مشکلات کو دور نہیں ہونے دیتے۔ منکرین تصوف ثانی الذکر کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں۔ کہ صوفیاء کے کلام میں اصل کے اختلاف میں مطالب نکلتے ہیں۔ معذور لوگوں کے عقائد احتیاط و پرہیز کے بغیر خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ ورنہ امن و سلامتی تو اسی بات میں ہے کہ تسلیم و رضا کی راہ اختیار کی جائے۔

قاعدہ ۵ ۔ دراصل علم کی بنیادیں بحث و تحقیق پر ہیں۔ اور حال کی بنیادیں تسلیم و تصدیق پر ہیں۔ چنانچہ عارف کی گفتگو اگر علمی معیار پر ہو۔ تو اسکی تکریم

اصول علم پر ہونی چاہیئے۔ جو کتاب و سنت سے اخذ ہو۔ یا آثار سلف سے یعنی تابعین اور تبع تابعین کے اعمال سے ہو علم کا اعتبار اصول پر ہے اور یہی اس کی دلیل ہے۔ جو کلام حال کی حیثیت سے کی جائے۔ تو تسلیم حال کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ اور نہ ہی اس بات کے لئے کوئی ثبوت میسر آسکتا ہے اس بات کا دارومدار تو وجد و ذوق پر ہے۔ اور علم تو ایک کی طرح اس کے پاس ہے۔ اگرچہ ایسا صاحب حال ہے۔ مگر اس کی اتباع و اقتدا لازم نہیں ہے۔ البتہ وہ لوگ جو خود صاحب حال ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک استاد طریقت نے اپنے شاگرد کو کہا کہ جاؤ۔ ٹھنڈا پانی پی آؤ کیونکہ ٹھنڈے پانی سے دل سے شکر خداوندی ادا ہوتا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ کہ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے کوزۂ آب پر دھوپ آئی۔ تو آپ نے اسے دھوپ سے نہ اٹھایا۔ لوگوں نے پوچھا۔ تو جواب دیا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ ہیں کوزۂ آب کو اپنی نفسانی خواہشات کے لئے اٹھا رہا ہوں۔ اس استاد طریقت نے یہ سن کر فرمایا یہ صاحب حال بزرگ ہیں۔ ان کی اتباع اور اقتدا اوروں کے لئے ناروا ہے۔

قاعدہ ۱۷۸۔ وجد و حال کی کیفیت جب بھی صاحب وجد و حال کو اختیار کار سے معذور بنا دے اور وہ اپنے نفس پر قادر نہ رہے اور مجبور محض ہو جائے۔ اسے مجنون کہا جائے گا۔ اور اس کے لئے نماز روزہ اور شرعی حدود ساقط ہو جاتی ہیں۔ بشرطیکہ اس کا وجد اور حال صحیح اور محقق ہو۔ ایسے حالات میں قضائے ماقات ضروری ہے۔ جونہی وہ ہوش میں آئے۔ مکمل کھبی

اختیار کی دنیا میں آئے گا۔ اس کے لئے تمام احکام شریعت کی قضا ضروری ہو گی۔ مگر جو واقعی مجنون ہے۔ اس کے لئے احکام شرعی کی بجا آوری یا قضا ضروری نہیں۔ اس عذر و رفع مواخذہ کے باوجود ایسے شخص کی اقتداء ناجائز ہے۔

شیخ ابوالحسن نوریؒ کا جلاد کے سامنے وجد کرنا۔ ابوحمزہ خراسانیؒ کا کنوئیں میں مطمئن رہنا۔ حضرت شبلیؒ کا داڑھی کو نورہ لگانا دس من پھاڑنا ہزار دینار کی تھیلی دریائے دجلہ میں پھینکنا۔ اور اس طرح کے اور حالات و کوائف سب وجد و حال کے ضمن میں آتے ہیں۔ اور سماع کے وقت جو کیفیت وجد۔ رقص اور حال طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بھی اسی ضمن میں شمار کی جائیگی۔ بشرطیکہ یہ تکلیف اور تصنع سے نہ کی جائیں۔ اور ضبط و اختیار سے باہر ہوں صاحب وجد کو معذور اسی صورت میں سمجھا جائیگا جب اسے ایسی تمام کیفیات کی مبالغہ۔ تعصب اور تصنع کے بغیر مسلم و محقق ہوں۔

ایک عورت دیوانہ وار جناب رسالتمآب صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس پر حالت صرع و جنون طاری تھی اور پاگلوں کی سی حرکات کیسے ساتھ اپنی حالتِ زار کی شکایت کرنے لگی۔ آپ نے اسے ارشاد فرمایا کہ۔

" صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے گا۔ اور اس صبر کے صلے میں تمہیں بہشت بریں اور اس کی نعمتیں ملیں گی۔ اگر ایسا نہیں تو میں دعا کرتا ہوں۔ کہ تمہیں شفا نصیب ہو۔ تاکہ اس مصیبت سے تمہیں نجات ملے

وہ عورت اس بات پر رضا مند ہو گئی۔ کہ میں صبر کروں گی۔ اور بہشت بریں حاصل کروں گی"

سرکار دو عالم کا اس عورت کیلئے دعا کرنا۔ اور اس کا صبر کر کے بہشت بریں کی بشارت پانا۔ اور پھر حضرت کا شفا طلب کرنا اور اس عورت کا حالتِ جنون میں صبر کرنا۔ اس بات کی علامت ہے کہ وہ عورت مجنون ضرور تھی۔ مگر اس نے اپنی حرکاتِ ماضیہ سے اسی وقت معذرت حاصل کر لی۔

قاعدہ ۲۔ یہ چیز ذہن نشین کرنا بڑی ضروری ہے۔ کہ احکامِ شریعت اور حدود شرعیہ کے ساقط کرنے کے لئے کوئی بڑا سے بڑا ثبوت اور بڑے سے بڑے اعمال قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ اور حدود شرع کا جاری ہونا بھی اس بات کے لئے ضروری نہیں۔ کہ اس سے خصوصیات اور انکا رد فع ہو جائے۔ اور یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ حقوق شرعی یا حدود ہر ایک پر بدستور نافذ ہوں۔ اثباتِ حق اور نفاذ حدود ہر حالت میں ضروری ہے۔ مگر ضبط و اعتدال کی رعایت نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔ اور حدود شرعیہ نافذ کرتے وقت مبالغہ اور افراط سے بچنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں ہی حرمتِ ایمانیہ اور عزتِ اسلامیہ ہے۔ اگر حدود شرعی کا اطلاق افراط و تفریط سے کیا گیا تو اس کی نسبت چونکہ بارگاہِ رب العزت سے ہوتی ہے۔ اس لئے اعتدال سے کام لینے سے ذات باری پر حرف آئیگا۔ اسی وجہ سے فرمایا کہ جو لوگ حد اعتدال سے گذرتے ہیں مقربانِ حضرت مطلق اور منتسبانِ درگاہ

حق کو ضرر پہنچاتے ہیں۔ اور اس کی تلافی بعد میں مشکل ہو جاتی ہے یہ نقصان اقامت حق کی علامات میں سے نہیں بلکہ حق سے تجاوز کی دلیل ہے۔

گو ارتکاب معصیت اور بے اعتدالی رتبۂ ولایت اور مرتبۂ خصوصیت کے منافی نہیں ہے۔ حضرت شبلیؒ نے قتل حلاجؒ کا فتویٰ دیا تھا۔ اور جریریؒ نے قید طویل اور بید زنی کا حکم دیا تھا۔ منصورؒ نے تو اسی وقت کہا تھا کہ مسلمانوں کیلئے میرے قتل سے بڑھ کر کوئی کام مشکل تر اور نزدیک مصلحت نہیں ہے۔ دینی نصیحت تو اسلئے کی جاتی ہے کہ انسان بے دینی اور الحاد سے پاک صاف ہو جائے۔ یہ بات اعترافِ جرم اور اعانت قتل کے لئے تو نہیں۔ واللہ اعلم۔

قاعدہ ۳۔ کسی شخص کے لئے یہ عقیدہ بنا لینا کہ وہ ہر گناہ و لغزش سے پاک اور مبرا ہے اور وہ کامل اکمل ہے۔ درست نہیں ہے کیونکہ کوئی انسان بھی نقص بشریت سے خالی نہیں ہے۔ اور عظمت و عصمت تو صرف انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہے۔ ولایت کیلئے معصوم عن الخطاء والنسیان ہونا شرط نہیں۔ بلا اختیار خطا و معصیت منافی مرتبہ قرب خداوندی اور ساقط درجۂ ولایت نہیں۔ سید الطائفہ حضرت جنیدؒ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا ھَلْ تَزْنِی العارف (کیا عارف بھی زنا کرتا ہے) آپ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد فرمانے لگے۔ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ازل میں تقدیر الٰہی ایسی ہے کہ یہ حقیقت ظاہر ہو تو اس سے چارہ کیا ہو سکتا ہے۔ البتہ عارف کو ارتکاب معصیت کے

بعد توبہ کرلینا ضروری ہے کیونکہ انسان گناہ و معصیت سے تباہ نہیں ہوتا بلکہ ترکِ توبہ سے تباہ ہوتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ اس نقطہ کی وضاحت کرتا ہے شیخ ابن عطاء اللہ اسکندری اپنی تصنیف "کتاب الحکم" میں فرماتے ہیں۔ ایتعلق ھمۃ العارف بغیر اللہ (کیا عارف کی ہمت غیر اللہ سے متعلق ہو سکتی ہے؟) اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں کیونکہ غیر اللہ سے ہمت کا تعلق معرفت و ولائیت کے منافی ہے۔ ویدہ دانستہ اگر ہمت کو غیر اللہ سے متعلق کر دیا جائے۔ تو نہ معرفت رہے گی اور نہ عارف رہیگا۔

قاعدہ ۹۱۔ جاننا چاہیئے۔ کہ کسی مکروہ و مباح امر جس سے فتنہ و فساد کو روکنے کے لئے فعل حرام کا اختیار کرنا بغیر محکم کے بغیر جائز نہیں۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ کہ اگر کوئی شخص کسر نفسی یا حصول گمنامی کیلئے کوئی ایسا کام اختیار کرے جس کے متعلق علمائے دین کا متفقہ فیصلہ ہے تو بات ناجائز ہے مگر ایسا کام جس میں علماء و فقہاء میں اختلاف ہے۔ اور آسان بھی ہے۔ اگر اس میں اصلاحِ احوال کے لئے بعض حضرات نے تجربہ کیا ہے۔ تو اس کے جواز کی مندرجہ دو شرائط کا ہونا ضروری ہے۔

شرط اول۔ وہ کام خلاف مذہب اور حکم فتوائے شریعت کے نہ ہو جس کی تقلید واتباع کی جاتی ہو۔

شرط دوئم۔ طرفین قوی عقل پر ہوں۔ اور قولِ ضعف اور مذہب ضعیف پر عمل نہ کریں۔ اور مصلحت حال پر نگاہ رکھیں۔ اور وہ حکایات جو بعض ارباب

احوال کے حالات پر مشتمل ہیں۔ ان پر بھی اعتماد کریں۔ مگر چونکہ وہ اس سے منع کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ قصہ سرقہ حمام کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ جیسے کہ ایک عارف نے چوری کی۔ جو شریعت میں حرام ہے۔ تاکہ وہ عوام الناس کی نگاہ میں حقیر و بدنام ہو جائے۔ اور اسے قصوروار سمجھنے لگیں۔ تاکہ عوام الناس اس سے نفور ہو کر دور رہیں۔ اور وہ یادالٰہی کے لئے وقت نکال سکیں۔

ایک شیخ زہد و تقویٰ میں بڑے مشہور تھے۔ اور صلاح و مراد میں معروف تھے۔ مخلوقِ خدا ان کے دروازہ پر جوق در جوق آتی رہتی تھی۔ انہوں نے عوام الناس کا رجوع اپنی طرف دیکھا۔ اور لوگوں کو تعظیم و تکریم کرتے دیکھا تو خیال آیا کہ یہ بلا میرے سر سے ٹل جائے تو اچھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے دل میں ایک حیلہ سوچا اور ایک حمام میں جا گھسے۔ وہاں ایک شخص کے کپڑے پڑے دیکھے۔ تو اٹھا کر پہن لئے اور چلے گئے۔ کپڑوں کا مالک جب حمام سے نکلا تو کپڑوں کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر کہیں سے نہ ملے۔ آخر کار بازار میں جا کر دیکھا۔ تو شیخ اپنے خرقہ کے نیچے اس کا لباس پہنے کھڑے ہیں۔ اس نے انہیں پکڑ کر خوب زدوکوب کیا۔ شہر کے لوگ جمع ہو گئے اور ذلت و خواری کے سارے سامان سامنے آگئے۔ شیخ کا یہ واقعہ جب زبان زد خلائق ہوا تو شہر کے لوگ بدظن ہو گئے اور تعزیر و سزا کے فیصلے کرنے لگے۔ اس کے بعد کوئی شخص شیخ کے پاس کبھی نہ آیا۔ اور وہ یادالٰہی میں مشغول ہو گئے۔

اس واقعہ کے چند پہلو قابل غور ہیں۔ شریعت میں کسی کے کپڑے اٹھا کر پہن لینا قابل مواخذہ چوری نہیں۔ اور نہ ہی اس پر شرعی حد لازم آتی ہے شریعت

ہیں جس چوری کی حرمت آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی کا مال پوشیدہ طور پر چھپالیا جائے مگر حمام، مسجد، خانقاہ، عوامی آمد و رفت کی جگہ ہے۔ یہاں سے کسی مسلمان بھائی کی چیز اُٹھالینا اور اجازت کے بغیر اُٹھالینا اخلاقی طور پر بُری بات ہے۔ مگر قانونی طور پر قابلِ مواخذہ نہیں۔ ایسی باتیں مکروہات میں آتی ہیں۔ حرام نہیں ہیں۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آپ کا ایک عزیز آیا، اور اپنی تنگدستی و غربت کی شکایت کرنے لگا۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تو بڑا آسان کام ہے۔ تھوڑا سا خرچ کرنے سے تمہارا روپیہ ہاتھ آسکتا ہے۔ اس نے عرض کیا۔ فرمایئے۔ آپ نے بتایا کہ تھوڑے سے اخروٹ لیکر ایک تھیلے میں بھر دو۔ گلے میں ڈال کر داڑھی صاف کرادو۔ اور اس ہیئت کذائی میں اکابرینِ شہر کے پاس جاؤ۔ راستہ میں جو لڑکا تجھے شرارت سے دھولیں مارنے آئے۔ اسے ایک اخروٹ دے دینا۔ یہ کام کروگے تو تنگدستی اور غربت جاتی نظر نہیں آئے گی۔ اس نے حیران ہو کر کہا۔ سبحان اللہ! میں ایسا گیا ہوا کام کس طرح کر سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ تمہارا سبحان اللہ کہنا تقدس نفس کے لئے ہے تسبیح حق کے لئے نہیں۔ آپ نے فرمایا تم نہ تو اس بارگاہ سے کچھ حاصل کر سکتے ہو نہ روحانیت سے تمہیں کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا یہ کہنا کہ داڑھی منڈاؤ۔ واقعی حکم نہیں تھا، اور نہ ہی وہ یہ چاہتے تھے۔ کہ بندگانِ شہر کے پاس جاتے ہوئے لڑکوں

سے دھولیں کھاتا پھرے۔ بلکہ وہ اس مرید کا اخلاص اور عقیدہ کی پختگی کی آزمائش کرنا چاہتے تھے۔ کہ اسے آپ کے ساتھ کس قدر خلوص ہے اور وہ کتنی تکالیف برداشت کرنے کے قابل ہے۔ حالانکہ یہ کبھی ہو سکتا کہ آپ ایک ایسے کام کی ترغیب دیں۔

علما کا کہنا ہے کہ یہ چیز از روئے شریعت درست ہے کہ کسی شخص کے حلق میں لقمہ اٹک جائے اور جان پر آبنے۔ اور پانی نہ ملے۔ تو موت سے بچنے کے لئے شراب کا گھونٹ پی سکتا ہے۔ با ایں ہمہ کہ حرمتِ شراب متفق علیہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ کہ حُبِ بقائے حیاتِ دنیا جو ایک فانی ہے۔ کیلئے حرام مطلق چیز کو جائز قرار دے دیا ہے تو حصول اخلاص، اطاعت اور قربِ حضرت ربّ العزت جو حقیقی زندگی اور حیاتِ ابدی کا باعث ہے۔ کیونکہ ایسے معاملات کو جائز قرار نہ دیا جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کو شراب کے جواز پر قیاس کرنا درست نہیں۔ اور نہ ہی یہ مثال صحیح آتی ہے۔ کیونکہ شراب کا گھونٹ چھوڑ دینے سے زندگی چھوڑ دیتا ہے۔ جس پر وجود کا مدار اور موجود کا بقا ہے۔ اور پھر اگر شراب سے ایسے حالات میں اجتناب کیا جائے تو ایک انسانی قتل میں اعانت کے برابر ہے۔ جو جمہور علمائے کرام کے نزدیک شریعت میں سخت حرام ہے۔ مگر شہرت وجاہ حرام نہیں۔ جو حرکات وسکنات اور اقوال واحوال جو محققین ملامتیہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ وہ ایک امر حرام یا مکروہ کے ارتکاب میں نہیں۔ بلکہ وہ اپنی شہرت کو داغدار کر کے خلقِ خدا سے علیحدگی کا ایک

بہانہ تلاش کرتے ہیں۔ اور اپنی عبادات چھپاتے ہیں۔ اور بعض ناپسندیدہ عادات کو ظاہر کرنے کے لئے۔ اور ایسے ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں۔ جو عوام الناس کی نگاہ میں تو خلاف شرع نظر آئیں۔ مگر حقیقت میں خلاف شرع نہ ہوں۔

ان کی نیت اپنے اعمال و عبادات کی نگہداشت ہے نہ کہ مخلوق سے اخفا کی۔ کیونکہ مخلوق کو دکھانا یا نہ دکھانا تو ایک ہی جیسا ہے۔ الغرض اس سے وہی مراد ہے جس سے یہ لوگ بھاگتے ہیں۔ درحقیقت صوفی اپنے معاملات میں سیدھا اور سچا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ مخلوق سے بالکل بند ہے۔ اور لوگ ترک اور نیل وجود کو ایک جیسا ہی خیال کرتے ہیں۔ حضرت ابو العباس مرسی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

مَنْ اَرَادَ الظُّھُوْرَ فَھُوَ عَبْدُ الظُّھُوْرِ وَمَنْ اَرَادَ الْخَفَاءَ فَھُوَ عَبْدُ الْخَفَاءِ وَعَبْدُ اللّٰہِ سَوَاءٌ عَلَیْہِ اَظْھَرَ اَوْ اَخْفٰی۔

جو شخص ظاہریت کا ارادہ کرے وہ بندۂ ظہور ہے اور جو اخفا کی نیت کرے وہ بندۂ خفا ہے اور خدا کے بندے پر تو ظاہر و باطن ایک ہی جیسا ہے۔

قاعدہ ۱۰۱۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اہل طریقت کے ہاں مقصود بالذات مخالفت نفس نہیں۔ بلکہ موافقت حق ہے اگر نفس موافقت کی راستے میں رکاوٹ نہ ہو۔ اور خواہشات شریعت کے تابع ہو جائیں تو مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ احادیث میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔ کہ جب نفس حق سے موافقت کرے تو یوں سمجھئے۔ جیسے انسان کو شہد کے ساتھ مکھن کی غذا مل گئی ہے، واقعی

ہوا و نفس کو حق کے تابع ہونا ایسا ہے۔ جیسے شیر و شکر باہم مل جاتے ہیں۔ لڑکے کے والدین اپنے لڑکے کو حکم دیں کہ تم نے صرف حلوہ ہی کھانا ہے۔ اور نانِ جویں سے روک دیں۔ ظاہر ہے۔ اس کے لئے یہ عمدہ غذا اس عام خوراک سے بہتر اور نفع بخش ہوگی۔ اور وہ ساری بدمزگی سے بچ جائے گا۔ یہاں بھی کچھ لوگ نفس کی مخالفت میں اتنا مبالغہ اور اصرار کرتے ہیں۔ کہ اصل مقصد (یعنی اخفائے حق) ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اور وہ مخالفت حق کرنے لگ جاتے ہیں۔ اکثر سنن و نوافل۔ اور طاعات و عبادات جس سے نفس قدرے مانوس ہو چکا ہے۔ ترک کر دیتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر علاج نفس میں بعض اوقات مفید اور صحیح بھی ہوتا ہے۔ مگر اہلِ سلوک اس راہ کی دشواریوں کے ساتھ ساتھ نفس کی مخالفت پر ہر وقت نگاہ رکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔

بعض شاذلیہ سلسلے کے مشائخ تو ہر سالک اور ہر طالب کی ہدایت اور تربیت ان کی طبیعت کے مطابق کرتے ہیں۔ وہ سابقہ حالت کو دور کرنے اور نئی کیفیتِ حال کو قائم کرنے میں جلدی نہیں کرتے اور مجاہدہ و ریاضت میں سختی نہیں کرتے۔ اور وظائف و اشغال بھی ان کی طبیعت کے مطابق کرائے جاتے ہیں۔ اور مزاج کو بڑے ملائمت۔ راحت۔ سہولت اور آسانی سے رام کر کے منزلِ مقصود کی طرف لے آتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے۔ راہِ حق کا بیرونی سفر سالک کی خواہ طبع کے مطابق ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ وصولِ حق کی دولت ہیں۔ کیونکہ بعض اوقات حرکت طبعی کے خلاف راہ چلنے سے منزلِ مقصود دور ہو جاتی ہے۔

کتاب الحکم کے مصنف شیخ بن عطاء اللہ اسکندری اپنی کتاب "تاج الفردوس" میں فرماتے ہیں۔

لَا تَاخُذْ مِنَ الْاَذْکَارِ اِلَّا مَا یُعِیْنُکَ الْقُوَی النَّفْسَانِیَّۃُ عَلَیْہِ بِحُبِّہٖ — کسی ذکر کو حاصل نہ کرو مگر اس ذکر کو جس کی قوت نفسانیہ مدد کرے اور دوستی اللہ سے زیادہ ہو۔

قطب وقت شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلہ شاذلیہ کے امام اور منتہی مانے جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

اَلشَّیْخُ مَنْ دَلَّکَ عَلٰی رَاحَتِکَ — شیخ وہ ہے۔ جو تمہیں راحت کا راستہ دکھائے یہ بات حدیث شریف کے معنی کے عین مطابق ہے

یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا۔ — آسان کرو دشوار نہ کرو۔

مزید فرمایا گیا۔ جو شخص تمہیں دنیاداری کی طرف راہ نمائی کرتا ہے وہ تمہارے حق میں خیانت کرتا ہے۔ جو سخت مجاہدہ کی طرف بلاتا ہے۔ اس نے گویا رنج و مصائب کے دروازے کھول دیئے۔ اور جو شخص اللہ تعالےٰ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ اس نے گویا ترکیب اکسیر ہدائیت بتادی۔

قاعدہ نمبر ۱۔ جس طرح معنی کی رعائیت لفظ میں لانا ضروری ہے۔ اسی طرح قالب لفظ میں معنی کا روح ڈالنا بھی اشد ضروری ہے جس طرح مرعات لفظ یعنی معنی ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہیں۔ اس طرح اس کی وضاحت و تشریح سننے والے کے دماغ میں ضروری ہیں۔ پہلے معنی کی صورت اور اس کا ربط و ضبط دل سے ہونا چاہیئے۔ پھر اس کا حفظ اور زبان پر لانا

ضروری ہے۔ اس طرح لفظاً اور معناً مقصود حاصل ہوگا۔ اور سالک اصل مطلب تک پہنچ سکے گا۔ اس طرح راستے کی دشواریاں دُور ہو جائیں گی اور سختیاں ختم ہو جائیں گی۔ اگر یہ بات نہ ہو۔ تو محض معنی کو ضبط کرنے سے بہت ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ضلالت وجہالت کے بادل امنڈ آتے ہیں بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ محققین الفاظ وعبادت کی غلطی سے وہ حقیقت حال معلوم کرنے ورطۂ حیرت میں جا پڑے اور ایسے لوگوں کو ظاہر پرست علماء نے کفر و بدعت اور فسق و فجور سے منسوب کیا۔ متاخرین میں بہت دفعہ ایسا ہوا ہے۔ اور اب بھی ہوتا ہے بعض اوقات عوام کی وجہ سے نقصان ہوتا ہے۔ ایک معنی کی حقیقت کسی معتبر اور مستند شخصیت سے معقول معلوم ہوتی ہے۔ اور وہی حقیقت دوسرے سے غیر مستند اور نامعقول دکھائی دیتی ہے۔ اور بعض چیز ایک ہی شخص سے ایک تو مستحسن اور دوسرے وقت غیر مستحسن ہوتی ہیں۔

اس طرح جس طرح حالات کے بدلنے سے معنی کی کیفیت بدل جاتی ہے ویسے ہی سامع کی کیفیت قلب بدلنے سے معنی کا اثر مختلف ہو جاتا ہے

حدثوا الناس بما یعرفون اتریدون ان یکذب اللہ ورسولہ۔	تم لوگوں سے اس طرح بات کرو کہ وہ سمجھ جائیں۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ لوگ خدا اور رسول سے انکار کرنے لگیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ سے لوگوں نے پوچھا کہ بہت سے لوگوں نے آپ کو ایک ہی مسئلہ پوچھا ہے۔ مگر آپ نے اسی سوال کے جواب جدا گانہ

اور مختلف دیئے۔ یہ کیا بات ہے۔ کہ مسئلہ کا حکم تو ایک ہی جیسا ہونا چاہیئے تھا۔ آپ نے جواب دیا نہیں۔ بلکہ اندازہ فہم سائل ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اُمِرْنَا اَنْ نُکَلِّمَ النَّاسَ عَلٰی قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ کہ ہم انسانوں کی عقلی سطح کے مطابق بات کیا کریں۔

قاعدہ ۱۲۔ یاد رہے کہ نگاہِ قلب کی بے بصری بعض اوقات طریقت کے راستوں میں خلل انداز ہوتی ہے۔ اور اس کا نام مخالفت شرع ہے اور اسی بے بصری سے قومیں مصائب میں گھر جاتی ہیں۔ اور از روئے شریعت ظاہر یہ ایسے حالات میں ہی اعتراضات وانکار کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ اس بات کا خیال کرنا ضروری ہے۔ کہ ایسے اقوال کو احتیاط سے استعمال میں لایا جائے۔ اور ان کے مآخذ کتاب وسنت سے لئے جائیں۔ اور جب بھی بات کی جائے بڑی ہوشیاری اور بیدار مغزی سے کی جائے۔ تاکہ ہاتھ سے مطلب نہ چلا جائے اور اس طرح معترض بھی کسی عتاب میں نہیں پڑتا۔

حضرت سلیمان درانی فرماتے ہیں۔ بہت کم دفعہ ایسا ہوا ہے۔ کہ ایک بڑا عجیب نکتہ میرے ذہن میں آیا اور ایک زمانہ ذہن میں رہا۔ اور وہ نکتہ اپنی حسن وخوبی ولطافت ومحبوبی کی وجہ سے زبان حال سے فریاد کرتا رہا کہ مجھے قبول کر لیا جائے۔ میں بہت اچھا ہوں۔ مجھے دل میں رکھا جائے۔ مگر اس نکتے کو اس وقت تک قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ جب تک دو گواہ عادل یعنی کتاب وسنت اس کی حسن وخوبی کی شہادت نہ دے دیں۔

جو صوفی مخلوقِ خدا کے ساتھ شریعت کی روشنی میں سلوک نہیں کرتا اور محض حقیقت کو سامنے رکھ کر خدا اور رسول کے وہ احکامات جو انہوں نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے منتخب فرمائے ہیں نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ اللہ کے راستہ میں اپنے اعمال و اشکال۔ احوال و اقوال میں بے غم نہیں ہو سکتا۔ یا وہ خود ہلاک ہو جاتا ہے۔ یا وہ دوسروں کو ہلاک کرتا ہے۔ خواہ اس کا ایسا حال کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ بعض عارفوں کا ہوا ہے۔ ایک عارفِ الٰہی نے کیا اچھی بات ہے۔

من عامل الحق بالحقیقة۔ والخلق بالشریعة فهو صدیق ومن عامل الحق بالشریعة والخلق بالحقیقة فهو زندیق ومن عامل الحق بالشریعة والخلق بالشریعة فهو مومن سنی

جو شخص حق کا معاملہ حقیقت سے کرے۔ وہ مخلوقِ خدا کو شریعت کی روشنی میں ہدایت کرے وہ صدیق ہے اور جو شخص حق کے ساتھ معاملہ کرنے وقت شریعت کو سامنے رکھے مگر باطن میں احکام شریعت کی پیروی نہ کرے وہ زندیق ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے معاملات اور مخلوق خدا کے ساتھ سلوک شریعت کی روشنی میں کرے۔ وہ سنی مومن ہے۔

قاعدہ نمبر ۱۳۔ جب کوئی مشکل پیش آئے یا ذہن میں کسی قسم کا شک و شبہ پیدا ہو جائے۔ ایسے حالات میں جبکہ ظاہراً کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکے تو ایسے مقامات پر توقف اور تامل بڑا ضروری ہے۔ اور اگر دلیل قاطع اور حجت ساطع موجود ہو تو توقف اور سکوت سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ اور اس طریقہ کی بنیاد و اساس حسن ظن پر ہے۔ اسے دلیل پر ترجیح دینا چاہیئے۔ یہ مسئلہ اس بات

سے واضح ہو جائے گا۔ کہ ہزار ہا کفار کا کفر محض اشتباہ بہ اسلام نکالنا درست ہے۔ مگر ایک مومن کا محض شک وشبہ کی بنا پر ایمان سے نکالنا درست نہیں۔ درحقیقت اہل قبلہ کو کافر کہنے سے اجتناب کرنا اسی نکتہ پر ہے۔

ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ اجتہاد کی ظاہری مضبوطی اور دلیل کا مقتضا ... قبول وانکار سے واجب اور لازم ہے پس ایسا ہی اعتقاد واجب و لازم ہے جس اعتقاد میں کوئی دوسرا افعال نہ ہو۔ اس میں امر الٰہی ہی کارفرما و راہ نما ہوگا۔ چنانچہ ایسے مقام پر صوفیہ کی ایک جماعت سے اختلاف رائے کیا ہے اور ان سے متشبہات اور موہمات قولاً اور فعلاً ظاہر ہوئی ہیں انہوں نے اس سے اپنا کام سنوارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک فرقے نے اس بات سے انکار بھی کیا ہے اور دوسرے نے سکوت اختیار کیا ہے حقیقت میں دیکھا جائے تو ان لوگوں نے جو طریقہ بھی اُن پر ظاہر ہوا ہے۔ اور جو چیز بھی انکے سامنے آئی ہے۔ اس کو اعلیٰ واولیٰ تصور کر لیا ہے۔ ایک شخص نے مشائخ طریقت سے ہے۔ ما تقول فی ابن العربی۔ آپ مقدمہ شیخ ابن عربی کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ

هُوَ اَعرَفُ بکل فن من اهل کُلِّ فن	وہ ہر علم میں بہترین عالم ہیں۔ اور ہر فن میں ماہر ہیں۔

سوال کرنے والے نے کہا کہ میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ ابن عربیؒ کیسے عالم تھے یا کس فن میں ماہر تھے۔ کیونکہ اس مسئلہ پر تو بہت اختلاف ہے کہ آپ کو کس قدر علم وفن ہے۔ میرا مدعا یہ تھا۔ کہ آپ ان کے اعتقاد کے متعلق کیا

کیا رائے رکھتے ہیں۔

اختلف فیہ من الکفر | لوگوں نے آپ کے کفر سے قطب ہونے
الی القطبانیہ | تک اختلاف کیا ہے۔

یعنی ایک جماعت آپ کو کافر جانتی ہے اور دوسری نے آپ کو قطب مانا ہے۔ آپ فرمائیے کہ آپ کس طرف ہیں۔ ارشاد فرمایا۔ اَسلِم تَسلَم۔ ہمارا مذہب تو سرنگوں ہونا اور تسلیم کرنا ہے۔ اور عزت و تکریم ہی میں نجات ہے۔

اندریں حالات تکفیر میں خطرہ ہے۔ اور مبالغہ تعظیم میں نقصان و ضرر کا احتمال ہے۔ تاکہ عوام مبہمات اور موہومات میں نہ پڑیں اور مضمون و مطالب کی باریکیوں میں پڑ کر غلطیاں نہ کریں۔

قاعدہ ۱۸۱۔ لوگوں نے صوفیاء کرام کے کمالات کا انکار پانچ وجوہات سے کیا ہے۔

اوّل۔ لوگ صوفیاء کرام کو بلند مرتبہ۔ علو شان اور تصفیہ قلب اور بلحاظ کمال پر دیکھنے کے عادی ہیں۔ جونہی کسی صوفی کو اس معیار سے گرا ہوا پاتے ہیں ان کا حسن ظن بدظنی میں تبدیل ہو جاتا ہے صوفیائے کرام بھی بعض اوقات ان تمام متوقع کمالات سے دستکش ہو جاتے ہیں۔ آداب تصوف ترک کر دیتے ہیں۔ اور دین کو مساوات کا نام دے دیتے ہیں۔ اور سلوک و فقر کی بعض خصوصیات کو معمولی خیال کر کے عامیانہ اعمال کا اظہار کر لیتے ہیں۔ اس سے ان پر اعتراض اور انکار کی نوبت آجاتی ہے۔ جو چیز پاکیزہ تر اور لطیف تر ہو۔ اس پر عیب و نقصان کا ظہور بھی نمایاں طور پر ہوا کرتا ہے۔ سفید ور نفیس

کپڑے پر اگر معمولی سا داغ بھی آجائے تو نمایاں نظر آتا ہے۔

ان شبہات و انکار کو دور کرنے کی ایک ترکیب یہ ہے۔ کہ ہم یہ بات ذہن نشیں کر لیں۔ کہ کوئی شخص بھی کمالاتِ مطلق کا مالک نہیں ہے۔ ہر ایک نقص بشریت میں رکھتا ہے۔ عصمت و معصومیت تو صرف انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے۔ خطا و ذلت اور عصبیت مرتبۂ کمال کے منافی نہیں ہے اور نہ اس سے درجۂ ولائیت ختم ہوتا ہے۔

دوئم۔ صوفیائے کرام کے انکار و اعتراض کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ یہ لوگ اپنے بلند خیالات اور اعلیٰ مقامات کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ان کے علمی اور روحانی اشارات اور دقیق نکات عام لوگوں کی سمجھ سے بالا تر ہوتے ہیں۔ ان کے پاس علم تصوف ہوتا ہے۔ جو تمام علوم سے شریف ترین اور لطیف ترین صنف علم ہے۔ اس علم کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ قطع نظر اس کے کہ لوگ صحیح ذوق اور صریح کشف رکھتے ہوئے بھی ان مسائل کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں۔ کہ اگر اس آسمان کی پہنائیوں کے زیر سایہ علم تصوف سے شریف تر اور لطیف تر علم ملتا تو اسے ہم ضرور حاصل کرتے۔ ہر علم کو عقلی قوت۔ تیزی طبع۔ قیل و قال اور بحث و جدال سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مگر علم تصوف پر مہارت حاصل کرنے کے لئے نہ جدتِ طبع کام آتی ہے۔ نہ سلامتی فطرت مفید ہوتی ہے اور ریاضت نفس۔ تصفیہ باطن اور تخلیہ سر کے باوجود فضل ایزدی بر طرا ضروری ہے۔ درحقیقت صوفیائے کے کمالات علمیہ کے انکار کی ایک وجہ ہے کہ ظاہر میں لوگ تصور فہم نقصِ استعداد

تنگ حوصلگی، گم گشتگی معرفت اور ضعفِ ایمان کا شکار ہوتے ہیں۔ بایں ہمہ اگر ان لوگوں کی نیتیں۔ ورع۔ خوفِ خدا اور حذر و سلامت پر ہوں تو وہ معذور و مجبور ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے۔ تو پھر وہی طریقِ توقف و تسلیم بہترین اور خوش ترین طریق کار سمجھا جائیگا۔

لوثم۔ اس طبقہ کے انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ اس برگزیدہ طبقہ کے بہت قسم کے لوگ دعویٰ دار بن گئے ہیں۔ جھوٹے۔ فریبی اور گندم نما جو فروش لوگوں کی زیادتی ہو گئی ہے۔ جو محض دنیاوی اغراض سے لبادۂ درویشی اوڑھ لیتے ہیں۔ اگر کوئی حق پرست صوفی صحیح دعوے لیکر بھی آئے تو ظاہر بین حضرات کی طبیعتیں اُسے تسلیم کرنے سے قاصر رہتی ہیں اور انہیں ہر سچا بھی فریب کار نظر آتا ہے۔

اندریں حالات ایک ایسی زبردست دلیل و برہان کی ضرورت ہو اکرتی ہے۔ جو سچ اور جھوٹ کو علیحدہ علیحدہ کر کے دکھا دے اور حق کو باطل سے جدا کر دے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دلیل صحیح اور حجت قاطع تو ہوتی ہے۔ مگر دیکھنے والوں کی قوتِ دریافت اسے نہیں پا سکتی۔ تو ایسے حالات میں بھی توقف اور تسلیم سے ہی کام لینا پڑتا ہے۔ بہتر تو یہ کہ ایسے مقامات پر سکوت اختیار کرے اور انکار و اعتراض کی بجائے خاموش رہے

چہارم عوام الناس ضلالت و گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں الحاد و بے دینی نے اپنے بھنور میں لے لیا ہے۔ وہ اکثر ظاہری شریعت پر اعتبار نہیں کرتے۔ حقیقت میں اس علم کا انکار نہیں۔ بلکہ مصلحت کا سبب نہ

اور ملاحظہ حکمت ہے۔ جیسے کہ اکثر جہلا سے ایسے حالات رُونما ہوتے رہتے ہیں۔

پنجم۔ بخل اور حرص بھی انسانی فطرت کے ضروری عناصر ہیں۔ عام انسانوں میں یہ چیزیں حسبِ مراتب اور حسبِ درجات، پائی جاتی ہیں۔ مگر صوفیا کا خیال اور علاقہ دل ہمیشہ حقیقت کی طرف ہوتا ہے۔ اس کا غلبہ تمام اعتبارات کو مٹا دیتا ہے۔ انہیں زندگی اور بعد ممات میں شہرت عوام۔ قبولیت انام اور رجوع خلائق کی دولت ملی ہے چنانچہ اس طبقہ کو چونکہ غلبہ اور ترجیح حاصل ہے۔ اور فقہا و علماء اس ترجیحی رتبہ کو بہ نظر تحقیق نہیں دیکھ سکتے۔ اور صوفیا کو علمائے و فقہا پر فضیلت و فوقیت ہے۔ تو یہ لوگ اگر صوفیا پر اعتراض کریں تو معذور ہیں۔ عارفین کے ذکرِ جمیل اور شہرت کا حقیقی سبب یہی ہے۔ ظاہری فقہا، و علماء اس فضیلت سے محروم ہیں۔ یہ لوگ حلیہ تصوف و تعبد اور توجہ الی اللہ سے عاری ہوتے ہیں۔ کیونکہ فقہ صفاتِ نفس میں سے ایک نفس کے ساتھ منسوب ہے۔ پس یہ صفتیں بھی موصوف کے ساتھ فانی ہو جاتی عارف اور عالم کی نسبت پروردگار عالم جو قدیم اور قائم بالذات ہے ازل سے ابد تک باقی ہے۔ وہ مر نہیں سکتے۔ پھر خاص کر وہ لوگ جو نفس کی موت کے بعد حی لایموت کے ساتھ نسبت قائم کر چکے ہیں۔ موت کے ہاتھوں ہرگز فنا نہیں ہو سکتے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہی وجہ ہے۔ کہ مجاہدانِ فی سبیل اللہ جام شہادت نوش کرنے کے بعد بھی اعلائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے حسًا اور معنًا جاں نثار کرتے رہے ہیں۔ وہ حیات ابدی اور معنوی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں مرتے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ
ان لوگوں کو گمان نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں جو اللہ کے راستے میں شہید ہوئے ہیں۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔

اسی قاعدے پر مصلحائے امت اور اولیائے کرام کے اعمال و عبادات بھی اعلائے کلمۃ اللہ اور خدمتِ دین میں وقف ہوتے ہیں۔ وہ حیاتِ معنوی کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ان کا ذکر خیر اور کرامات دوامی ہیں کہا گیا ہے قَدْ مَاتَ قَوْمٌ وَّھُمْ فِی النَّاسِ اَحْیَا
قوم مر چکی ہے۔ مگر بھی زندہ ہیں۔

فائدہ یہ جاننا ضروری ہے۔ علماء و فقہاء کی وہ کتابیں جو صوفیاء کے رد اور انکار میں لکھی گئیں ہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کے اور منہیات سے بچنے میں بڑا کام دیتی ہیں۔ اور نفس کو سنوارنے میں بڑی نفع بخش ثابت ہوتی ہیں۔ مگر پھر بھی ان سے نقصان کا احتمال بہت زیادہ ہے۔ بہت کم لوگ ان سے حقیقت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور صحیح معانی نکال سکتے ہیں۔ ایسی کتابوں سے فائدہ حاصل کرنا اور انہیں انداز سے مطالعہ میں مندرجہ ذیل شرطوں کے تابع ہے۔

شرط اول۔ کتاب کے مطالعہ کرتے وقت اپنے نفس کے احوال پر غور کرنا چاہیئے۔ اور اس کا مواخذہ اور محاسبہ کرنا چاہیئے اور ہرگوئی چرب زبانی اور مجلس آرائی سے احتراز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ لوگ تو خود گم گشتہ راہ اور غیر سالکان درگاہ ہیں۔ جو محض جودت طبع۔ تیزی ذہن اور فہم دذکا کی بدولت مقام صدق و تحقیق اور سلوک و طریق میں آ کر ورع اور احتیاط میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں کسی کامل و اکمل بزرگ کی صحبت نصیب نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے حقیقی معانی پیش نہ کئے جائیں۔ کیونکہ لوگ غرض سخن کو نہ پہنچے ہیں نہ پہنچ سکتے ہیں ہو سکتا ہے۔ کہ (رموز و اسرار تصوف) ان کے عقل و فہم سے بعید ہوں۔ اور بیان کرنے والے کو ہی بیہودہ گو اور غلط گفتار تصور کرلیں۔ بالفرض اگر وہ ان باتوں پر اعتقاد کر کے حقیقت پر اعتماد بھی کر لیں اور اسرار و رموز کو ذہن نشین بھی کر لیں۔ اور عمل کر کے موصوف بھی ہو جائیں۔ مگر پھر بھی وہ کسی نہ کسی مقام پر مغالطہ میں پڑ جائیں گے۔

سادہ لوح مرید جو عقیدت و خلوص رکھتے ہیں انہیں شیخ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ انہیں سخن فہمی کا سلیقہ نہیں۔ اور حقیقت کی کسی بات کو سمجھنے کے اہل نہیں۔ اور مشائخ کبار کے ساتھ ان کی عقیدت و خلوص میں تفرقہ نہیں آنا چاہیئے۔ وعظ و نصیحت کے وقت تنبیہہ و توبیخ کی ضرورت محسوس ہو۔ تو کسی کا نام لینے کی بجائے اس بات کو موضوع سخن بنائیں جس پر انہیں اعتراض ہو۔ مگر ان حضرات کی عظمت اور جلالت شان کو

برقرار رکھا جائے کیونکہ بزرگانِ دین کی خطاؤں پر پردہ ڈالنا اور ان کی لغزشوں کو درخورِ اعتنا خیال نہ کرنا۔ وقت کی اہم ترین ضرورت میں سے ہے اور اس میں سعادتِ دارین اور سرمایہ برخورداری ہے۔ دین کی مدد کرنا۔ اسلام کی حفاظت کرنا۔ اور مراعاتِ شریعت کو نگاہ میں رکھنا بڑا ضروری ہے اور اللہ کے دین کی خدمت کرنے والا بڑے اجر و ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ اور دین کی خدمت کرنے والا ہمیشہ فتح مند ہوتا ہے اور نفس و خواہشات کا بندہ تو محروم و مغضوب رہتا ہے۔ نفسانی خواہشات سے دیانتداری بر تنا بھی فاسد ہے۔ اور جو نفسانی اغراض اور شیطانی وسوسوں سے کی جائے وہ باطل ہے۔

شرطِ دوئم۔ صوفیاء کے ساتھ حسنِ ظن اور خوش عقیدگی کا اظہار بڑا ضروری ہے۔ اور ان کے معاملات کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے کی بجائے یوں گمان کرنا چاہیئے کہ یہ امور ظاہری طور پر مخالفِ شریعت ہیں۔ مگر حقیقت میں مخالف نہیں۔ بالفرض اگر مخالف بھی ہوں۔ تو حالتِ سکر و حال اور وجد میں صادر ہوتے ہیں۔ ان بزرگانِ دین کی عزت و کمال کا میدان طعن و تشنیع کے گرد و غبار سے صاف اور مبرا ہے۔

شرطِ سوئم۔ وہ اعتقاد جو رد و انکار کا سبب بن سکتے ہیں۔ اور جن کا انجام وسیلہ کے سد راہ ہوتا ہے تحقیق کے بغیر مقام صدق و صفا پر تقلید و اتباع ان لوگوں کی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تقلید و مطابقت تو شریعت کے ظاہری احکام میں آتی ہے۔ ذوق و حال وجد و احوال سے ان کا کوئی

تعلق نہیں۔

فقہاء کا ایک طبقہ ایسا ہے جس نے صوفیائے کرام کے رد و انکار میں بڑا زور مارا ہے۔ اور انہوں نے بڑی شدت اور سخت گیری سے کام لیا ہے ابن جوزی ایسے ہی فقہاء میں سے تھے۔ یہ بزرگ بہت بڑے فقیہہ ادیا کابر علمائے حدیث سے گذرے ہیں۔ یہ اہلِ تصوف کے سدِ راہ ضرور بنے۔ مگر بڑی متانت سے بہت سے اعتراضات کرتے رہے۔ ان کی تصانیف ایسے اعتراضات سے بھری پڑی ہیں۔ انہوں نے مشائخ کی حکایات قصص و کلمات ان کے حالات دسرگزشت بطور استشہاد کے لکھی ہیں اور صوفیاء کے انکار و رد میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے۔ خاص کر اپنی تصنیف "تلبیس و ابلیس" میں تو آپ نے مبالغہ اور قسم کے کیا ہے کہ میرا اصل مقصد علم و سنت کو ظاہر کرنا ہے۔ بدعت سے بچنا ہے نہ کہ ان بزرگوں پر طعن و تشنیع مقصود ہے اور نہ اہلِ کمال کی مذمت مطلوب ہے۔ مگر کتاب کے مضمون سے اہلِ تصوف سے انکار قوی اور نزاع معنوی جھلکتا ہے۔ در اصل یہ کتاب مادۂ بدعت کو دُور کرتی ہے۔ اور جہالت کے حجاب اُٹھا دیتی ہے۔ پند و نصائح کے محققین نے اس کتاب کے مطالعہ کو بڑا ضروری خیال کیا ہے۔ اس کتاب میں نصوص اشتباہ سے بھی منع کیا ہے۔ مگر اس کتاب میں اسرار و حقائق اور وجد و حال کو صریحاً فحاشی

ے ابو الفرج شہاب الدین ابن جوزی جناب غوث الثقلین سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی کے ہمعصر تھے اور مشہور عالم شیخ سعدی شیرازی کے استاد

لکھا ہے۔

شرطِ چہارم انسان کو اپنے علم کے تصور اور فہم کی کوتاہی کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ اور کہا جائے۔ اے اللہ ان بزرگانِ دین کے امور و اقوال میں تجھ پر چھوڑتا ہوں۔ ہمارا قصور معاف فرما۔ اور میری آرزو پوری کرے از روئے انصاف ہم یوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ توقف۔ و انکار جو دوسروں پر کرنا ہے۔ اپنے نفس پر کرنا چاہیئے۔ ان بزرگانِ طریقت پر نہیں ہونا حاصل کلام یہ ہے۔ کہ دین و شریعت ایک واضح راستہ ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ ہر کام اس کی اتباع و روشنی میں کرے۔ اگر کوئی شخص شرعی مسئلہ پوچھے تو اس کے مطابق جواب دینا چاہیئے۔ خاص کر اگر صادقانِ راہِ طریقت اور متوجہانِ درگاہ کے حال کے متعلق گفتگو کی جائے۔ تو جہاں تک ممکن ہو و تغافل سے کام لے۔ اور یہ بات ذہن نشین رکھیں۔ کہ انکار و ردِ بعد تامل کا سبب ہوتیں۔ اور تصدیق و اعتقاد سے ہی فتح الباب ہوتی ہے۔ واللہ الہادی ومنہ التوفیق

خاتمہ

کتاب کے خاتمہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ حق کے مجمل اعتقاد کے متعلق چند اشارات ہدیۂ قارئیں کر دیئے جائیں۔ تاکہ مقطع کلام مطلع کتاب کے عین مناسب ہو۔ عقائد کے تمام اقسام تین ہیں۔

قسم اول - ربوبیت پر اعتقاد لانا بڑا ضروری ہے، اجمالی طور پر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعتقاد کو ممکنات سے تشبیہ و تنزیہہ کے ذریعے سمجھا دیا جائے اور صفاتِ کمالیہ پر ثابت قدمی سے ایمان رکھا جائے. حقیقت میں ایمان اسے کہتے ہیں. علمِ الٰہی کے ساتھ حقیقت کو سونپا جائے اور متشابہات و مشکلات کو بھی مدِّ نظر رکھا جائے. امام مالک رضی اللہ عنہ نے بڑے اچھے پیرائے میں اظہارِ خیال کیا ہے. آپ سے جب الرحمٰن علی العرش استوٰی (وہ بڑا مہربان عرش پر قرار پکڑتا ہے) کے معنی دریافت کئے گئے تو آپ نے فرمایا۔

اَلْاِسْتِوَاءُ مَعْلُوْمٌ وَالْکَیْفُ غَیْرُ مَعْقُوْلٍ وَالْاِیْمَانُ بِہٖ وَاجِبٌ وَالسُّؤَالُ عَنْہُ بِدْعَۃٌ	قرار پکڑنا تو معلوم ہوا ہے مگر اس کی کیفیت معلوم نہیں کہ کس طرح ہے. اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اسکے متعلق سوال کرنا بدعت ہے

شیخ ابوالنجیب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صوفیائے کرام کا مذہب سات صفات سے واسطہ ہے۔ اور وہ حیات. قدرت علم- سمع. بصر- مشیئت اور ارادہ ہیں۔

قسم دوئم درجاتِ نبوت اور اثباتِ نبوت کے کمال و اختتام پر ایمان لایا جائے. عظمتِ انبیاء پر ایمان رکھا جائے. ان کے کمال کا اعتراف ہر علم. عمل اور حال سے کیا جائے. اور بعض

حالات وکمال جو ہماری عقل اور علم کے احاطہ میں نہیں آسکتے اور مشکل ومشتبہ ہیں۔ انہیں تسلیم کر لیا جائے۔ اگر انبیاء کرام کو اللہ تعالےٰ سے کوئی خطاب وعتاب آئے۔ یا کوئی بات وجہ تمکنت وعزت ہو۔ تو ہمیں اس بات میں مشارکت کی راہیں نہیں ڈھونڈھنی چاہئیں اور گستاخانہ گفتگو کا آغاز کرنا چاہیئے۔ جس طرح مالک چاہے وہ کر سکتا ہے۔ اور اس کے غلام کو یہ حق نہیں کہ اس کے کاموں میں دخل دیتا رہے۔ اسی طرح ہمیں بھی ان حضرات کے اعمال واحوال میں دخل دینے سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

جناب سیدنا رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مجمل ایمان یہ ہے۔ کہ مرتبہ الوہیت کے علاوہ تمام کمالات وکرامات سے آپ نے اوصاف کا ثبوت بہم پہنچایا جائے۔ نصاریٰ کی طرح اپنے انبیاء کو خدا تو نہ بناتا پھرے۔ مگر آپ کی نعت وحمد کے لئے اور جس قدر زیبا اور شایان شان صفت ہو سکے بیان کرے ؎

نخواں اورا خدا از بہر امر شرع وحفظ دیں
وگر ہر وصف کس میخواہی اندر حش املا کن

قسم سوئم درجات پہ علی قدر مراتب ایمان رکھنا چاہئیے کیونکہ صرف انبیا علیہم السلام نے تمام احادیث وآیات انسانوں تک پہنچائی ہیں۔ ان کی صدق اور راستی ہمارے عقیدہ کا ایک جزو ہے۔ اس صدق وراستی میں نہ کسی قسم کا تغیر وتبدل آتا ہے اور

تفصیل و تاویل سے کام لیا جا سکتا ہے۔

اٰمَنَّا بِمَا جَاءَ عَنِ اللّٰہِ عَلٰی مُرَادِ اللّٰہِ وَبِمَا جَاءَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ عَلٰی مُرَادِ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَبِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ اَکْمَلَ الرَّاسِخِیْنَ فِی الْعِلْمِ عَلٰی مُرَادِھِمْ

ہم ان چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جو اللہ کی طرف سے اس کی مراد کے مطابق آئی۔ اس چیز پر رسول خدا کی طرف سے رسولِ خدا کی مراد کے مطابق آئی۔ اور کاملین کے علم پر یقین رکھتے ہیں جو ان کی مراد کے مطابق آئی۔

بس اس قدر حصولِ ایمان اور صحت اعتقاد کے لئے کافی ہے۔ اور اسی کو ایمان اجمالی کہتے ہیں۔ اور تفصیل یہ ہے کہ ضروریات دین کی ہر چیز پر جدا جدا ایمان لایا جائے۔ اور اس پر گرویدگی کا اظہار کیا جائے

واللہ موفق وصلی اللہ علیٰ خیر خلقہٖ محمد وآلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل

مؤلفہ

حضرت مولٰنا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ

خلیفہ

حضرت مولٰنا خواجہ غلام محی الدین قصوری مجددی دائم الحضوری رحمۃ اللہ علیہ

جس میں مولٰنا خلیل احمد انبیٹھوی (مؤلف براہین قاطعہ) اور دیگر دیوبندی اکابر سے اعتقادی اور نظریاتی اختلافات پر فیصلہ کن مناظرہ کی مکمل روئیداد ہے۔ یہ مناظرہ برِصغیر پاک و ہند میں تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب ایک مدت سے نایاب تھی۔ علمائے کرام کے پیہم اصرار پر اسے نہایت دیدہ زیب انداز میں شائع کیا گیا ہے۔

صفحات: ۴۰۰

سرورق چہار رنگ — خوبصورت جلد

قیمت: ۹ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

مکتبہ نبویہ (میلارام روڈ) لاہور

علم خیر الانام

مصنّفہ

مولٰینا عبد السّلام رضوی نقشبندی

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے علوم لامتناہی پر ایک مُفصّل کتاب ہے۔ فاضل مُصنّف نے آقائے دو عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے علوم و کمالات کا بڑے اچھے انداز میں جائزہ لے کر اس بات کی کوشش کی ہے کہ آپ کی عظمت و محبّت کو قاری کے دل و دماغ میں بٹھادیا جائے جن لوگوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے ان کی رائے میں اس کتاب نے وقت کی ضرورت کو بہت حد تک پورا کر دیا ہے طلبأ اسے محنت سے پڑھتے ہیں، علمأ اسے حوالے کی کتاب سمجھ کر دیکھتے ہیں۔ تحقیقی کام کرنے والے اسے ایک بہترین ماخذ خیال کرتے ہیں اور صُوفیا، اس کے مضامین سے لُطف اندوز ہوتے ہیں آپ آج ہی اس کتاب کے لئے ہمیں لکھیں۔ کتابت عمدہ۔ ٹائیٹل دیدہ زیب۔ کاغذ اعلیٰ۔ قیمت ۵ روپے۔ قیمت کاغذ دوئم ۴ روپے۔ آپ کا حکم آنے پر بذریعہ ڈاک ارسال کی جاسکتی ہے۔

سہ آسماں را حق رسد گر خون ببارد بر زمین

"خون کے آنسو"

مرتبہ :- خطیبِ مشرق مولانا مشتاق احمد نظامی (ایڈیٹر پاسبان الہ آباد)

:- جس میں :-

- علمائے دیوبند کی رسوائے زمانہ تحریروں پر بے لاگ تبصرہ ہے۔
- ان کی سینکڑوں کتابوں کا لبِ لباب۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں معاندین کے کھلے کھلے نظریات پر اتنی شدید گرفت کی ہے کہ بائیدو شائیدہ بھارت کے کانگریسی علماء اور جمعیۃ العلمائے ہند نے اس کتاب کی ضبطی پر پورا زور صرف کر دیا اور اپنی سیاسی خدمات کا واسطہ دیکر حکومت ہند پر زور دیا کہ اسے ضبط کر لیا جائے۔ مگر چونکہ کتاب کے تمام ماخذ علمائے دیوبند کی مشہور کتابیں ہیں اس لیے اس کی ضبطی کا کوئی جواز نہ مل سکا۔ اس کتاب کی اہمیت اور ضرورت کا صرف اسی بات سے اندازہ لگایئے کہ مختصر سے عرصہ میں پاک و ہند میں اس کے کئی ایڈیشن تقسیم ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس محدود تعداد میں چند نسخے ہیں جو آپ کے مطالعہ کے لئے وقف ہیں۔ نفیس کتابت، آفسٹ طباعت دیدہ زیب رنگین ٹائیٹل اور عمدہ جلد۔ قسم اول مجلد ۵۰ روپے۔ قسم دوم ۴۰ روپے۔

پہلے آرڈر بھیجنے والوں کی پہلے تعمیل کی جائے گی۔

مکتبہ نبویہ (میلا رام روڈ) لاہور

مندرجہ ذیل کتب آپکے تعمیلِ ارشاد کیلئے وقف ہیں

۱۔ شفاء العلیل۔ ترجمہ القول الجمیل مجلد، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی	۲/۵۰ روپے
۲۔ ابریز ترجمہ تبریز حصہ اول مجلد سید عبد العزیز دباغ رح	۱۰/۰۰
۳۔ سنت خیر الانام مجلد۔ حضرت مولانا محمد کرم شاہ صاحب ازہری	۶/۰۰
۴۔ اطیب البیان، ردّ تقویۃ الایمان مجلد حضرت شاہ نعیم الدین مراد آبادی	۴/۰۰
۵۔ ملفوظات اعلیٰحضرت مجلد چار حصے مکمل اعلیٰحضرت احمد رضا خاں صاحب بریلوی رح	۱۱/۰۰
۶۔ حدائق بخشش " "	۲/۰۰
۷۔ تعبیر الرؤیا، مترجم مجلد علامہ امام محمد بن سیرین رح	۵/۰۰
۸۔ شان حبیب الرحمٰن مجلد مفتی احمد یار خان صاحب	۶/۰۰
۹۔ کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، اعلیٰ حضرت احمد رضا خان صاحب بریلوی رح	
چوب قلم قیمت :	۱۰/۰۰
۱۰۔ الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح	۲/۰۰
۱۱۔ نزہۃ الخواطر فی مناقب شیخ سید عبد القادر، ملا علی قاری رح	۲/۵۰
۱۲۔ تفسیر نعیمی ہر شش حصہ	۹۵/۰۰
۱۳۔ فتاوی رضویہ۔ جلد دوم مطبوعہ بھارت	۱۲/۰۰
۱۴۔ " سوم " مبارک پور	۲۵/۰۰
۱۵۔ " چہارم " "	۲۵/۰۰

۱۷۔ التشیر الکامل (شرح مایۃ العامل) مطبوعہ مراد آباد	۷/۰۰
۱۸۔ التشیر القاری (شرح بخاری) جلد اول "	۷/۰۰
۱۹۔ مجدد اسلام مطبوعہ بھارت	۲/۵۰
۲۰۔ دُرِ ثمین۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۱/۲۵
۲۱۔ سید احمد کی صحیح تصویر۔ وحید احمد صاحب مسعود بدایونی	۲/۵۰
۲۲۔ الانسان فی القرآن مجلد	۱۰/۰۰
۲۳۔ بہارِ شریعت مکمل مجلد	۳۲/۰۰
" " غیر مجلد	۲۸/۰۰
۲۴۔ مراۃ شرح مشکوٰۃ۔ پانچ حصے۔ مفتی احمد یار خاں صاحب	۳۵/۰۰
۲۵۔ خیرات الحسان (اردو عربی) علامہ ابن حجر مکی	۵/۰۰
۲۶۔ اولیائے ملتان مجلد۔ سید محمد اولاد علی گیلانی	۶/۰۰
۲۷۔ بابا فرید گنج شکر سید نصیر احمد جامعی	۳/۵۰
۲۸۔ حقیقت روح انسانی۔ امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ	۲/۵۰
۲۹۔ مولانا روم مجلد	۲/۷۵
۳۰۔ مکتوبات حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی	۵/۰۰
۳۱۔ فوائد حضرت بندہ نواز مصنفہ محمد معشوق حسین خاں سلطانی	۱/۱۲
۳۲۔ تعارف قرآنی	۲/۵۰
۳۳۔ کلید القرآن	۳/۰۰
۳۴۔ سچی حکایات۔ حصہ اول مجلد۔ ابوالنور محمد بشیر	۵/۰۰

۳۵- سچی حکایات - حصہ دوم مجلد ابوالمنور محمد بشیر - ۵/۰۰

۳۶ " " سوم " ۵/۰۰

۳۷ دیوبندی مذہب - مجلد غلام مہر علی گولڑوی ۷/۰۰

۳۸- الثورۃ الہندیہ عربی معہ تعلیقات فضل حق خیرآبادی ۵/۰۰

۳۹- مکتوبات امام ربانی فارسی - سات حصے مجلد ۴۰/۰۰

۴۰- تذکرہ نوری (حالات ابوالحسن نوریؒ) ۵/۰۰

۴۱- الامتیازہ بین الحقیقت والمجاز - مولانا نبی بخش حلوائی ۱/۵۰

۴۲- اوراقِ غم ابوالحسنات قادری ۵/۰۰

۴۳- سیرت بایزید - علامہ فضل الٰہی عارف ۲/۵۰

۴۴- تذکرہ نور - علامہ محمد ارشد پناہوی ۵/۰۰

۴۵- دُرالمعارف ملفوظات شاہ غلام علیؒ ۴/۰۰

۴۶- جاءالحق - مفتی احمد یار خاں صاحب ۶/۰۰

۴۷- علمی لطائف ابوالمنور محمد بشیر ۱/۲۵

۴۸- خطبات مجلد " " بر سہ حصہ ۱۸/۰۰

۴۹- مرج البحرین اردو مجلد شیخ عبدالحق دہلویؒ ۲/۰۰